سلسلہ مطبوعات مکتبہ ابراہیمیہ

دیوان طباطبائی

یعنی

صوت تغزل

۱۹۳۳ء

مجموعہ کلام

نواب حیدر یار جنگ بہادر علامہ علی حیدر طباطبائی نظم

ناشر

انجمن امداد باہمی مکتبہ ابراہیمیہ (محدود) حیدرآباد دکن

۱۹۳۳ء
۱۳۵۱ھ

بسم اللہ سبحانہ تعالیٰ

ادب الکاتب و الشاعر

غزل

تمام دنیا کی شاعری میں مضمون پہلے مقرر ہو جاتا ہے پھر اس مضمون کے مناسب قافیے اختیار کئے جاتے ہیں۔

غزل ایک ایسی صنف شعر ایران میں ایجاد ہوئی جس میں مضمون سے پہلے قافیہ و ردیف مقرر کر لیتے ہیں پھر اسی قافیہ و ردیف کے مناسب مضامین اختیار کرتے ہیں۔

قافیہ و ردیف کا تعین ایک چوسر کے پانسے میں چھکا بھی نکل آتا ہے پو بھی آتی ہے۔

یہ دو لوہیں ہیں جن سے مضمون کا طلسم کھل جاتا ہے۔

دو میل راہ میں جو مضموں کا پتہ بتا دیتے ہیں۔ جو شخص پتہ کو سمجھ جاتا ہے منزلِ مقصود تک پہنچ جاتا ہے۔ نہیں تو بھٹک کر گم کردہ راہ ہو جاتا ہے۔

غزل گو قرعہ پھینکتا ہے اور اس کی قسمت کا جو سہم ہے نکل آتا ہے۔

قافیہ ورردیف دو پر پرواز ہیں جس سے کبھی غزل گو عرش تک پہنچ جاتا ہے اور خزانۂ عرش سے مضمون اڑا لاتا ہے۔ ؎

لے گئی عرشِ معلی پہ مجھے فکرِ سخن
جا پڑا پرتوِ آئینۂ زانو ہو کر

اس کے علاوہ ردیف میں محاورے کی شوخی پیدا کرنا سننے والوں کے دل کو بے چین کر دیتا ہے مرزا داغ مرحوم کو اس باب میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

(لگی ہوئی) ردیف ہے اس میں داغ نے یہ شعر نکالا ؎

جب میں نے آہ کی ہے قیامت اٹھائی ہے
آواز پہ ہے شورشِ محشر لگی ہوئی

(کچھ بھی نہیں) ردیف ہے اس میں یہ شعر نکالا ؎

معلوم ہے حشر کی سب کہتے ہیں یوں ہی دوں ہے
فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں

یعنی شرم نے منہ سے بات نہ کرنے دی تو شوق نے پاؤں کی حرکت سے
کام لیا اور شرم پر غالب آگیا (۲) یا جیسے دو شہزادے عون و محمد شہادت
کے شوق میں سے نکلے ہیں دونوں بھائیوں نے ساتھ ہی یزید کی فوج پر حملہ کر دیا
ہے تلواریں مارتے ساتھ ساتھ بڑھے چلے جا رہے ہیں کہ دشمن کی فوجیں
دونوں کے درمیان حائل ہوگئیں - اب بھائی سے بھائی جدا ہو گیا ہے
اس مقام پر دونوں کے یکایک مل جانے کو میر انیس یوں فرماتے
ہیں ؎

وہ شیر سا پہنچا جو ادھر یہ ادھر آیا
جان آگئی بھائی کو جو بھائی نظر آیا

یعنی قاتلوں کے نرغہ میں آجانے سے ایک کو ایک کی صورت
دیکھنے سے یاس ہوگئی تھی (۳) یا مثلاً حر کی آمد میں فرماتے ہیں ؎

برچھیوں اڑتے ہے دب جاتے ہیں فرس لوں سے
آنکھ لڑ جاتی ہے دریا کے نگہبانوں سے

گھوڑے کا اوڑنا اور دریا کا نظر آجانا یہ مضمون تو میر صاحب کا حد اعجاز
کو پہنچ گیا ہے۔ اس کے علاوہ آنکھ لڑ جانے میں یہ معنی ادا کئے ہیں
کہ تم نے پانی تو بند کیا ہے اب ہشیار ہو جاؤ میں آتا ہوں۔
غرض مسلسل مضمون میں ایسا سماں بندھ جاتا ہے کہ شاعر کو

ایسے موقع بھی مل جاتے ہیں کہ وہ دو لفظوں میں بہت سے معنے اور بہت سی باتوں کو ادا کر دے۔ غزل گو کو دو مصرعوں میں ایسا میدان کہاں مل سکتا ہے۔ اب ثابت ہو گیا کہ غزل گو شعر کی اس خوبی سے محروم رہتا ہے جسے طلسم یا سحر یا اعجاز کہنا چاہیئے اس میں شک نہیں کہ ایسا سماں باندھ دینا جس میں شاعرانہ جادو جگا سکے بڑے بڑے سخن سنجوں کو بھی شاذ و نادر نصیب ہوتا ہے لیکن غزل گو کے لئے تو ممکن ہی نہیں

آخر سیدھا رستہ چھوڑ کر

الٹی چال چلنے کا باعث کیا ہوا

سبب اس کا مشہور ہے کہ مبتدی اس قابل نہیں ہوتا کہ شاعرانہ مضمون سوچ کر نظم کر سکے آسانی کے لئے قافیہ و ردیف اسے بتائے جاتے ہیں۔ اب قافیہ کو ردیف کے ساتھ ربط دینے کے لئے اوسے مختصر سا مضمون سوچنا پڑتا ہے۔ جو دو مصرعوں میں تمام ہو جائے مثلاً فرہاد و بہزاد و صیاد قافیہ ہو تو وہی کوہکنی و مصوری و صید افگنی کا مضمون سامنے آئیگا۔

محمل و بسمل و منزل قافیہ ہو تو محمل لیلیٰ کی طرف اشارہ کرے گی بسمل قاتل کا پتہ بتائے گا اور منزل کے لئے تو جادہ پیش پا افتادہ ہے غزل گو سے کہے ہوے مضمونوں کو بار بار کہتا ہے اور فخر اس بات پر

کرتا ہے کہ کہنہ مضامین کو ہر مرتبہ لباس نو میں ظاہر کرتا ہے۔ غزل کے ایجاد کا دوسرا سبب یہی معلوم ہوتا ہے کہ معانی کو نئی نئی صورتوں میں دکھانے کی مشق پیدا ہو جائے۔

اس قیاس کے صحیح ہونے کا بڑا قرینہ یہ ہے کہ جس زمانہ میں غزل ایجاد ہوئی ہے۔ اسی زمانہ میں فن بلاغت کی تدوین و تہذیب ہو رہی تھی۔

پہلے شیخ المعتزبہ جو متوکل و معتصم عباسی کا معاصر تھا البیان والتبیین کے نام سے ایک مختصر سی کتاب شائع کی جو آجتک گویا درس میں جاری ہے۔

پھر امام عبدالقاہر جرجانی نے اسرار البلاغت لکھ کر آنکھوں پر سے پردے اٹھا دئے اور دلائل الاعجاز کی تالیف سے قرآن کے وجوہ بلاغت کو بے نقاب کر دیا۔

انھوں نے جو موتی رولے تھے وہ بکھرے ہوئے تھے علامہ سکاکی نے کو ہر شناہوا چن چن کر ایسی ایسی لڑیاں گوندھیں کہ فن کی تہذیب و ترتیب اس سے بہتر ہو نہیں سکتی۔

پھر بھی بعض علمار نے سکاکی پر دقیق نظر ڈال کر متن کو زیادہ منقح کر دیا۔ اسکی سیکڑوں نقلیں ہوئیں اور بلاد اسلام میں جابجا درس

ہونے لگے۔

آخر میں فاضل تفتازانی نے بذل جہد کرکے اس متن متین پر شرحیں
لکھ ڈالیں اور اسکے فیض کو عام کردیا عرب سے لے کر ہندوستان و سمرقند سے لے کر
جرجان تک معانی بیان کے درس جاری ہو گئے۔

اس فن کے پڑھنے سے اعجاز قرآن واضح ہوتا ہے اس سبب سے
فن بلاغت جزو مذہب سمجھا گیا خاص کر کے فن بیان علما نے اس امر کی
تعلیم کے لئے لکھا ہے کہ ایک معنی خاص کو متعدد طریقوں سے ادا کرنے
کی صورتیں کیا کیا ہیں۔

مثلاً تشبیہ استعارہ مجاز کنایہ پھر ان میں سے ہر ایک کے اقسام
گوناگوں ہیں

یعنی ایک معنی خاص کے ادا کرنے کے فن بیان میں سیکڑوں طریقے
ہیں جب اس فن کی تعلیم کا رواج عالمگیر ہو رہا تھا اوسی زمانے میں
غزل ایجاد ہوئی ہے یعنی جو پڑھیں اس کی مشق بھی کریں۔

سعدی کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک غزل کے مضامین
ایک ہی طرح کے چلے آتے ہیں اور بار بار کہے جاتے ہیں۔

یہ سب مضامین عامۃ الورود ہیں اس لئے کہ فطرۃ انسانی سب میں
مشترک ہے ایک ہی طرح کے ولولے ایک ہی طرح کی امنگیں

ایک ہی قسم کے جذبے سب میں پائے جاتے ہیں مضمون کہاں سے الگ الگ آئیں گے۔ طرز بیان کا الگ الگ ہونا البتہ ضرور ہے کلام میں دو چیزیں دیکھی جاتی ہیں ایک تو اصل مضمون دوسرا طرز بیان۔ ان دونوں میں اصل مضمون کسی کا مال نہیں اس لئے کہ وہ ہر شخص کا مال ہے ہاں طرز بیان اپنا اپنا الگ ہونا چاہیئے ورنہ سرقہ کا الزام عاید ہوگا۔

طرز بیان ہی وہ چیز ہے جس کے لئے علمائے اسلام نے فن بیان کو ایجاد کیا اور غزل گویوں نے اس مشق کو حد اعجاز تک پہنچا دیا۔

لکھنؤ کا ایک شاعر زنار بند جس کا سارا کلام زمانے نے شاید تلف کر دیا ایک عارفانہ مطلع غزل کا چھوڑ گیا ہے جو دلوں پر لکھا ہوا ہے اور کبھی نہیں مٹنے کا سے

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

میرے کرمفرما نواب عبدالرحمن خاں شاطر نے اس بیت سے کیا اچھا استنباط کیا ہے سے

بے محل پڑتا نہیں ہے ایک بھی تیرا قدم
کوئی ہے تجھ پر سوار اے ابلق لیل و نہار

اصل مضمون یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا ہر کام مصلحت و حکمت پر مبنی ہوتا ہے

اس مضمون کے ادا کرنے کے دو پیرایے دونوں بیتوں سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ اسے سرقہ نہیں کہہ سکتے۔ سرقہ کہنے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اس طرزِ ادا کو ترک کر دیا ہوتا

بلکہ بیدل کا یہ شعر ؎

چوں کاغذِ آتش زدہ مہمان بقائیم

طاؤس پر افشانِ چمن زار فنائیم

غالب کے اس شعر سے بہت مشابہ ہے ؎

کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ قمری پرواز

دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ طاؤسِ شکار

بیدل نے بے ثباتیِ عمر کے بیان میں کاغذِ آتش زدہ کو طاؤس پر افشاں سے تشبیہ دی ہے غالب نے جوشِ بہار کے بیان میں اس کاغذ کو دام جیسے اور اس کے شعلہ کو طاؤس سے تشبیہ دی ہے دام و شکار کی نازک تفصیل نے مضمون ہی کو کچھ کا کچھ کر دیا اس زمانے کے مضمون نگاروں نے غالب کے کلام سے صدہا سرقے نکالے اور شائع کیے مگر وہ خود ہی نہیں سمجھے نہ سمجھیں گے۔ غور سے دیکھیے تو اسے بھی سرقہ نہیں کہہ سکتے۔

مجھے ناصر علی کے اس مصرع سے ع

تپید در آئینہ جوہر چو ذرہ در روزن

غالب کا یہ مصرع یقینی اخذ کیا ہوا معلوم ہوتا ہے ع

پر افشاں جوہر آئینہ میں جیسے ذرے روزن میں

لیکن ذروں کا روزن میں پر افشاں ہونا تڑپنے سے کہیں بہتر معلوم ہوتا ہے

جلال اسیر کے اس شعر سے بھی ؎

جنوں بمستی و ہشیاری آزمود مرا

زبسکہ محو تو بودم زمن ربود مرا

دیکھئے مرزا غالب نے کیا خوب استنباط کیا ہے جو قابل وجد کرنے کے ہے ؎

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم

لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

ان دو مصرعوں میں کیا کیا مضامین عالی نکل آتے ہیں۔ کہ حیرت ہوتی ہے۔ اسیر نے بھی تمثیل کہا تھا غالب نے اس پر بھی ترقی کی خیر یہ لوگ تو بڑے مرتبے کے ہیں نواب سید محمد خاں رند جو حقیقت میں رند ہی تھے ان کو دیکھیے اور اس شعر کو دیکھیے ؎

مسافر ہوں اتر جاؤنگا پار اک دم میں

تجھ کو اے موج مبارک رہے دریا تیرا

اسی مضمون کو خواجہ میر درد نے اس طرح کہا تھا ؎

کرتی ہے بوے گل تو مرے ساتھ اختلاط ۔۔۔ پر آہ میں تو موج نسیم و زیدہ ہوں

اسی امید میں کہ شاید کوئی ایسا شعر نکل آئے عمر بھر فکر غزل نہیں چھٹتی اور تمام اصناف شعر چھوٹ جاتے ہیں۔

کبھی غزل گو دو مصرعوں میں ایسا مضمون باندھ جاتا ہے کہ وہ مسلسل نظموں میں اس برجستگی کے ساتھ نہیں بندھ سکتا نظیری کا یہ شعر لوگوں کے دلوں پر لکھا اور زبانوں پر جاری ہے۔

بوی یار من ازیں سست وفامی آید
گلم از دست بگیرید کہ از کار شدم

مرزا رفیع سودا نے اس سے یہ مضمون استنباط کیا اور اساتذہ کا کلام دیکھنے سے یہی استنباط کو مقصود ہوا کرتا ہے ؎

کیفیت چشم اسکی مجھے یاد ہے سودا
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

کوئی یہ نہ خیال کرے کہ میں سودا پر سرقہ کا الزام دھرتا ہوں ہرگز سرقہ نہیں یہ مضمون ہر ایک انسان کی فطرت میں داخل ہے جس زمانہ میں انگریزی کا مجھے شوق تھا اور گرے کی نظموں کا ترجمہ کر رہا تھا یہی مضمون ٹینسن کے یہاں میں نے اس لباس میں دیکھا کہ "شگوفوں نے بے خودی میں اپنے عطردانوں کا عطر لنڈھا دیا"

یہ بات وہم میں بھی نہیں آتی کہ نظیری کا یہ مضمون ٹینسن تک پہنچا تھا

اسی مضمون کو مونس نے اس طرح باندھا ہے کہ مسدس کے ایک
بند میں کربلا کی سرزمین کا ذکر کیا ہے جہاں بہار آئی ہوئی ہے۔ ع

بلبلیں پھول لئے پھرتی ہیں منقاروں میں

یہ مصرع پڑھ کر مجھ مرحوم کا یہ کہنا بھی یاد ہے کہ سب صاحب اس
مصرع کو یاد رکھیں۔ اس کے بعد دوسرے بند میں بنی فاطمہ کے نونہالو
کا ذکر چار مصرعوں میں کیا ہے بیت یہ ہے ؎

انکی نکہت جو گذر جاتی ہے گلزاروں سے
بلبلیں پھول گرا دیتی ہیں منقاروں سے

آپ نے دیکھا کس قدر پھیلا کر اس مضمون کو مونس نے کہا کہ انہیں
کہنا پڑا کہ سب صاحب اس مصرع کو یاد رکھیں۔
بادشاہ کے سبعہ سیارہ میں مرزا علی بہار مرحوم نے اسی مضمون کو س
میں کیا خوب کہا ہے ؎

باغ میں مدح کی بیتیں جو مزا دیتی ہیں
ڈالیاں جھوم کے پھولوں کو گرا دیتی ہیں

جس مضمون کے لئے مونس مرحوم کو مسدس کے کئی بند کہنا پڑے
نظیری و سودا و بہار نے دو ہی مصرعوں میں نظم کیا ہے۔
طولانی مضمون کو مختصر کرنے کی مشق غزل گو کو ہو جاتی ہے او

یسا ہونا بھی چاہیئے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مفاعیلن چار بار

ترے جلوہ کے آگے اپنی ہستی کو فنا پایا
یہ پیغام اجل ہم نے دمِ قالوا بلیٰ پایا
کیا پائے طلب کو قطع تو دستِ دعا پایا
خدائی بھر سے ہم نے ہاتھ کھینچا تو خدا پایا
رگِ گردن سے اقرب آسمان کے ماورا پایا
نہ پہچانا کبھی ہم نے اوسے اور بارہا پایا
نفس کو شہر خاموشاں کا ہم نے رہگرا پایا
رہِ بے نقش پا و کاروانِ بے درا پایا
تعلق ایک نعمت کو ہزاروں نعمتوں سے ہے
تری درگاہ سے جتنا ملا اس سے سوا پایا

تعلق ایک حسرت کو ہزاروں حسرتوں سے ہے
دل بے آرزو پایا تو سمجھو مدعا پایا

خدا اگر ہمت عالی بھی دے اور خاکساری بھی
سمجھنا چاہیے بس حاصل ارض و سما پایا

نہ اب پست و بلند دہر کو مڑ کر بھی دیکھوں گا
بہت گر پڑ کے میں نے جادہ صبر و رضا پایا

گدائی کا ملا تھا ٹھیکرا جو در سے ساقی کے
اسی کو بزم جم میں ساغر گیتی نما پایا

خوشی کیا سال نو کی غافلو اس دار فانی میں
یہ سوچو تو بھلا اک سال کھویا تم نے یا پایا

بھروسا زیست پر کچھ ہے نہ ایام جوانی پر
شرار سنگ اسے دیکھا اسے رنگ حنا پایا

جسے ہو وید کی حسرت سنبھلنا اس کا مشکل ہے
کلیم اللہ نے بھی مشل نرگس کے عصا پایا

چلی ہے سیل کچھ آزردہ چیں بر جبیں ہو کر
گدا کے گھر میں کیوں آئی تھی جو اک بوریا پایا

نہ سمجھے آبلہ پائی کو میری قافلے والے

نمک افشاں کوئی پایا کبھی تو شور ورا... پایا
زمینِ شعر پہ اے نظم ہم بھی شب کو گزرے تھے
اٹھا لائے ہیں دامن میں اسے جو کچھ پڑا پایا

(۹) (۲)

کلام حق ہے توریت اب مجھے یہ اعتبار آیا
خبر موسیٰ نے جسکی دی تھی وہ ناقہ سوار آیا
وہ اس وادی کے گرم و سرد و خشک و تر کو کیا جانے
جو مثلِ باد گزرا اور مانند شرار آیا
مدارِ آسماں کو تنگ سمجھا میری ہمت نے
میں اک فتراک کے حلقہ میں عمر اپنی گزار آیا
تعالی اللہ اک دائرہ میں یہ تفصیل مضمر تھی
کھلے گل کونپلیں پھوٹیں شگوفے نکلے بار آیا
یہاں جلوت ہے بت ہیں اور خلوت ویلدا کی ظلمت
ہزار آنکھوں سے میں اس بزم میں مثلِ شرر آیا
جہاں میں چند دن مہماں ہے ہر فرد و فقیر لیکن
وہ مہماں کیا بن کر جو لیا ہی مستعار آیا
زنِ دنیا نے گو غازہ کشی کی دل لبھانے کو

۳ (۱۵)

مگر اب بھی تو عارض پر نہ رنگ اعتبار آیا
محبت لالہ وگل کی جو تھی دل میں وہ کام آئی
پر طاوس پر آخر وہی نقش و نگار... آیا
گناہوں سے نہیں مہلت در توبہ پہ جانے کی
پکارا کرتی ہے رحمت کوئی اُمیدوار آیا

جہاں کو مژدہ اس جان جہاں کی آمد آمد کا
قیامت مصرع ثانی ہے جس کے مصرع قد کا
ہوئے افلاک پیدا نام جب آیا محمدؐ کا
طلسم عالم امکاں تھا یا رب قفل ابجد کا
مواعظ کے گہر عالم میں بکھرانے کو نور اسکا
ابھر آیا ہے غوطہ مار کر دریائے سرمد کا
زباں سے گو نہیں کہتے ہیں تھا انتظار اسکا
گواہی دے رہا ہی دل ہر اک قسیس و موبد کا
کسی میں ہے کہ عالم کا تسلّی دینے والا ہے
کسی انجیل میں لکھا ہوا ہے نام احمدؐ کا

(دو انگلیاں اٹھا کر رسول اللہؐ نے فرمایا تھا انا والساعۃ کھا تین ۱۲
(لغت میں موبد اور موبد دونوں طرح آیا ہے ۱۲)

تری رفتار میں بیشک ہے اعجاز مسیحائی
ہما بن کر فلک پر اڑ گیا سایہ ترے قد کا

براق تیز تگ جب طارم افلاک سے گزرا
تو مثل گرد رنگ اڑنے لگا چرخ زبرجد کا

تجھے معراج کی رفعت ہی فرش خاک پر حاصل
سر عرش اعلیٰ متکا ہے تیری مسند کا

تجھی سے عالم اسرار علم کن فکاں ہے تو
سبق روح القدس مکتب میں جب پڑھتے تھے ابجد کا

دعا مقبول ہو جاتی ہے تیرا نام لینے سے
ملا بندوں کو موقع حق تعالیٰ کی خوشامد کا

اللہ اکبر کیا صلہ تیرے نواسوں کو
کہ ان کا قصر ہے یاقوت کا ان کا زمرد کا

مسیر فرش تا عرش اک قدم مرکب کا ہے تیرے
مقام قاب قوسین ایک گوشہ تیری مسند کا

تعالیٰ اللہ ہے اس شاہ کی شان کرم ایسی
بھرم کھلنے نہیں پاتا منافق کی خوشامد کا

لہ رسول اللہ منافقوں میں گھرے ہوئے تھے اور سب سے مدارا کرتے تھے ۱۲

(۴)

نہ چھوڑے گا در حیدر کو اب نظم ثنا گستر
یہی در ہے رسول اللہ کے شہر علم بے حد کا
کہاں ہے کعب سیکھے ہم سے آئین ثنا خوانی
کہ نعت مصطفےٰ اور ذکر شمشیر مہند کا

(۱۴)

نظر آتا ہے ابر آسا گذرنا کوہساروں کا
کہ عالم عالم اجسام میں ہے بے قراروں کا
کیا ہے دستگیری کا جو وعدہ اسکی رحمت نے
کلیجا ہاتھ بھر کا ہو گیا امیدواروں کا
گلستاں ہو کہ خارستاں ہو دونوں جائے عبرت ہیں
یہ مقتل نیزہ بازوں کا وہ مقتل تاجداروں کا
نہیں ہے شرک سجدہ کی جہت مشرق ہو یا مغرب
سمجھتا ہے اگر تو اک مرجع سب اشاروں کا
کرم ادنیٰ پہ اعلیٰ سے زیادہ ہے تعالی اللہ
گلوں سے بیشتر نشو و نما ہوتا ہے خاروں کا

؎ فتح مکہ کے روز کعب نے جو قصیدہ آنحضرت کے سامنے پڑھا تھا اس میں رسول اللہ کی نسبت سیف من سیوف الہند کا لفظ تھا حضرت نے اصلاح دی کہ سیف من سیوف اللہ ہو

نہ شوخی اے صبا کر وضع میں اب فرق آتا ہے
غبار راہ نچا نہ ہو جائے کہیں ہم خاکساروں کا
ضلالت میں گھرے ہیں اور علائق مانع عزم ہیں
شب تاریک ہے اور کاٹنا ہے کوہساروں کا
بہت جلدی کی تو نے کوس رحلت کے بجا ئیں
کہیں تو نے ای اجل ماتم نہ دیکھا دوستداروں کا
شرار و برق کی فرصت سی کم ہے فرصت ہستی
کہ سیکھا ہے سمند عمر نے بھرنا طراروں کا
ہوا میں ان کے ذرے ہوں تو ہوں جو نامور گزرے
پتہ روئے زمیں پر تو نہیں ملتا مزاروں کا
بہانہ ڈھونڈھتی ہے اس کی رحمت تو یہ کیا جانے
گنہ ہے گردن مینا پہ واعظ بادہ خواروں کا
کہوں میں کیوں اسے عقد گہر پہنے ہوئے دیکھا
نظر آیا مجھے خورشید پر جھرمٹ ستاروں کا
کھلا رہتی ہے کیا سرمہ نگاہ سرمگیں تیری
کہ اف کرتا نہیں مارا ہوا تیرے اشاروں کا
منجم بھی ہے کیا اے نظم ہم فرقت نصیبوں میں

یہ اس کا جاگنا راتوں کا یہ گننا ستاروں کا

(۱۹) (۵)

جفا و جور کی حد ہو گئی سمجھیں گے ہم اچھا
ستائے جاؤ تم اچھا کئے جاؤ ستم اچھا
اجل بھی دیکھ کر آفت میں کر جاتی ہے رم اچھا
بھلا کب تک چھپاؤ گی یہ منہ دیکھیں گے ہم اچھا
مجھے دوڑا رہا ہے شوق منزل کا یہ کہہ کہہ کر
کہ گرنا بار بار اچھا ہے۔ اٹھنا دم بدم اچھا
دل مضطر کو میرے چھوڑ کر مشق جفا کیسی
یہ کافر تیر کے قابل ہے یا صید حرم اچھا
چھپایا اس نے منزل کو بتایا راستہ اس نے
غبار رہ برا ٹھہرا رہا نقش قدم اچھا
رہے گبر و مسلماں منزل مقصد سے بیگانہ
ملا اس راہ میں ہنگامۂ دیر و حرم اچھا
بگڑنا قہر تیرا مہرباں ہونا ہے ایک آفت
یہ انداز کرم اچھا ہے یہ طرز ستم اچھا
نہ دیکھ انداز آئینہ میں اپنا پوچھ لے مجھ سے

زمانہ بھر سے اچھا اور تیرے سر کی قسم اچھا

جواب صاف دیکر توڑنے کیوں ہو مری دل کو

مجھے لیت ولعل اچھی مجھے لا و نعم اچھا

مقام شکر ہے جو کچھ دیا جتنا دیا اس نے

مقدر میں نہیں ہرگز خیال بیش و کم اچھا

نہ کھوئی اپنی عزت کاسہ لیس اغنیا ہو کر

کبھی جام سفالیں سے نہ سمجھے جام جم اچھا

نفس وزدیدہ جانا خوابگاہوں میں حسینوں کی

نکالا سیر کا وقت اے نسیم صبح دم اچھا

کوئی پوچھے ذرا وازفتگان حسن سے اُس کے

وفا ہے یا جفا اچھی کرم ہے یا ستم اچھا

درماندوں کو سمجھائے کوئی للہ پوچھے تو

ملال آپس کا اچھا ملکے یا رہنا بہم اچھا

سناتا ہے ہر اک اپنی قدح کی خیر عالم میں

سمجھتے ہیں کہ سب سے آپ اچھے اپنا دم اچھا

اگر ایسا ہی پر آشوب ہے ہنگامہ ہستی

تو پھر شہر خموشاں خوب ہے ملک عدم اچھا

(۵)

لحاظ اتنا ابھی تک حضرت ناصح کا باقی ہے
وہ جو کچھ حکم فرماتے ہیں کہہ دیتے ہیں ہم اچھا
نہ پایا شعر ہم نے دفتروں میں اور سب کچھ ہے
زباں اچھی مضامیں خوب ہاتھ اچھا قلم اچھا
روانی کو کلام نظم کی انصاف سے دیکھیں
تو کھل جائے کہ ہے تلوار اچھی یا قلم اچھا

(۶)

کہاں تک راستہ دیکھا کریں ہم برق خرمن کا
لگا کر آگ دیکھیں گے تماشا اب نشیمن.. کا
گلستاں میں بھی کیا تم آتش افروزی کو آئے تھے
لگا تا ہے ہوا میں آگ اڑ کر رنگ گلشن کا
جو نازاں مردم آزاری پہ ہو اسکو یہ ہو مژدہ
اجارہ چونٹیوں کو مل گیا گور تہمتن... کا
جنازہ جس گھڑی پہنچا لب مرقد تو ہم سمجھے
ذرا بھی فاصلہ دیکھا نہ گہوارہ سے مدفن کا
نہیں ہے کارفرما رنج و راحت کا سوا اسکے
مری آنکھوں پہ سر پر شکر و شکوہ دوست دشمن کا

مسیحا و خضر کیا جانیں لذت کو شہادت کی
نہ دیکھی خون کی ندی نہ چشمہ آب آہن کا

نہ پوچھو دل فلک کے حادثہ سے کس طرح ٹوٹا
یہ شیشہ تھا نشانہ ہو گیا سنگ فلاخن کا

یہ کیا باعث کہ لب تک جان آ آ کر پلٹ جائے
اجل بھی کچھ اشارہ پا گئی اس چشم پرفن کا

خبر اس کی نہ تھی یہ بھی خلاف طبع گزرے گا
گلا کاٹا تھا ہم نے دیکھ کر انداز چتون کا

لئے جاتے ہیں کیا کیا حسرتیں ہمراہ کوئے قاتل سے
جنازہ اٹھتے اٹھتے ہو گیا ہے سینکڑوں من کا

وہ دیکھو صف کی صف بسمل ہوئی جس کی نگاہ سے
کوئی میری طرف منہ پھیر دے اس ناوک افگن کا

گریباں میرا تیرا دیکھنا اک ہاتھ میں ہو گا
کہے دیتا ہوں میں ناصح مزاج اپنا ہے الجھن کا

کیا تو قید لیکن یاد رکھنا چارہ گر یہ بھی
کہ توڑا ہو گا چوڑی کی طرح سے طوق آہن کا

سنیں [illegible]

ہوا یہ سلسلہ اپنی احادیث معنعن کا
وطن کا حال پوچھ اے نظم توسیلِ حوادث سے
ملے بجلی تو پوچھوں میں نشان اپنے نشیمن کا

(۷) (۱۴)

تجمل دیکھ کر تیرے شہیدانِ محبت کا
مسیحا و خضر پڑھنے لگے کلمہ شہادت کا
مرے دل سے اگر نکلا شرارہ سوزِ فرقت کا
خدا معلوم ہو کیا حشر خورشیدِ قیامت کا
مسیحا سے مداوا کیا ہو تیرے سوزِ فرقت کا
رہا مہرِ درخشاں کو بخار اور کیسی شدت کا
فرشتہ تو نہیں ہے پاکدامن ہو تو کیونکر ہو
کہ دل رکھتا ہے انساں اور دل بھی ایک آفت کا
نہ پوچھو دورِ گردوں میں حلاوت زندگانی کی
کہ اپنا خون پیتے ہیں مزا لے لے کے شربت کا
سلایا اس نے جب چاہا جگایا اس نے جب چاہا
ہمارے اور اس کے بیچ میں پردہ تھا غفلت کا
ذرا سن تو سہی کیا شور ہے شہرِ خموشاں میں

جو عاقل ہیں یہاں آکر سبق لیتے ہیں عبرت کا
شباب اس طرح سے تجز راکا ب معلوم ہوتا ہی
وہ باتیں اک زمانہ کی ہیں قصہ ایک مدت کا
فغان آبشار و اشک ابر و گریۂ شبنم
جدھر دیکھو ادھر رونا ہی اپنی اپنی قسمت کا
جو چھپ چھپ کر نہ روؤں راز پنہاں رہ نہیں سکتا
کہ میرے آنسوؤں میں رنگ ہی میری طبیعت کا
نہیں ہرگز مجال دم زدن آئینہ خانہ میں
ہے اس محفل میں ہنگامہ دو صد آئینہ حیرت کا
دل آزاری کی عالم میں ہوا چلتی ہی اے حیدر
بگولے رقص کرتے ہیں مٹا کر نقش تربت کا

(۸)

سوا جلوہ کے تیرے اور میرے دل میں کیا ہوتا
سمجھتا اس کو بت خانہ جو نقش ماسوا ہوتا
تجھے کیا سمجھ کر ناز یکتائی اٹھاتا ہوں
وگرنہ میں بتا دیتا جو کوئی دوسرا ہوتا
کسی کا ذکر کرکے اس قدر لی چٹکیاں میرے

گل خورو چمن میں ہنستے ہنستے رو دیا ہوتا

کیا تہ جس نے زانو مسندِ الفقر فخری پر
نہ کیوں نقشِ سلیماں اس کا نقشِ بوریا ہوتا

نہیں اٹھ سکتا مجھ سے جنبشِ مژگاں کا صدمہ بھی
کہ تو نے آنکھ پھیری میں نظر سے گر گیا ہوتا

وہ برہم ہو گئے زلفیں ذرا رخ سے جو سرکائیں
خطا گر اور کچھ ہوتی نہیں معلوم کیا ہوتا

مرے باعث سے عالم میں ہوا مشہور تو ورنہ
یہ شہرے ہر جگہ ہوتے یہ چرچا جا بجا ہوتا

تھکا ہارا تلاشِ منزلِ مقصد کا ہوں حیدر
قدم پر اس کے سر رکھتا جو کوئی رہنما ہوتا

(۱۷) (۹)

مٹا دی اس نے ہستی آستینوں کو اگر الٹا
عدم کا اٹھ گیا پردہ جو دامن کا کمر الٹا

نگاہِ ناز آئینہ میں رکھتی ہے اثر الٹا
ادھر دیکھو قیامت ہو گئی یہ جادو اگر الٹا

بہار آئی اٹھے بادل چلے صحرا کو دیوانے

ہوئی الجھن بڑا آزار دل الٹا جگر الٹا
نہ بھولیں گی کبھی وہ خلوتیں وہ عیش کی راتیں
کہ پردہ شام سے چھوڑا تو ہنگام سحر الٹا
موذن نے اذاں مغرب کی دی صبح شب فرقت
بجائیں نوبتی نے وردیاں الٹی گجر.. الٹا
وہ بل کھا کر اٹھے ہیں قتل کرنے کو پڑا تا ہوں
مجھی پر کچھ نہ کچھ الزام دھر دیگی کمر الٹا
صبا کی شوخیوں پر رشک کیسا مجھکو آتا ہے
کہ آنچل اس کا یوں سوتے میں بےخوف و خطر الٹا
جواب آیا نہ مرغان چمن سے میرے نالوں کا
گلے کو کس قدر پھیرا زباں کو کس قدر الٹا
وہ آئینہ جو میری آنکھ سے دیکھیں تو بتلا دو
کلیجہ تھام لیں پلٹ کرے تیر نظر الٹا
کسی نے آکے آنسو بھی نہ پونچھے ہجر کی شب میں
نسیم صبح نے منہ سے مرے دامان تر الٹا
گلی میں اس ستمگر کی نہ جائے لاش بھی میری
بہا دینا مجھے اے سیل اشک چشم تر الٹا

زباں منہ میں حریف کینہ جو کے ہر کہ بچھو ہے
نہ اک سیدھی سی بات اس کی نہ اس کا نیشتر الٹا

بہار باغ دوفی ہو گئی ہے مینہ برسنے سے
نظر آنے لگا ہر ایک تھالے میں شجر الٹا

لب دریا تماشا انقلاب دہر کا دیکھو
کہ پانی دوپہر بہتا ہے سیدھا دوپہر الٹا

براق اس طرح روز و شب کی حد سی ہو گیا باہر
نظر آنے لگا مہر مبیں سیدھا قمر الٹا

جلے میں غیر کیا کیا وہ جو خلوت سے مری نکلے
پریشاں باندھ کر گیسو دوپٹا اوڑھ کر الٹا

جو ہر سچ بات وہ نظم دو پہلو نہیں رکھتی
نظر آتا ہے یکساں رکھیے سیدھا یا کہ الٹا

(۹)

(۱۰)

صواب اپنی خطا کو اپنے عیبوں کو ہنر جانا
نہ ہے گم کردہ منزل رہزنوں کو راہ بر جانا

ہمیشہ ہمت عالی کو اپنا راہبر جانا
اسی رستے چلا جس راستہ کو پر خطر جانا

گلا گھونٹا ہے میرا تو نے کیوں او خوف رسوائی
شکست رنگ کے نغمہ کو بھی کیا شور و شر جانا

یہ میری سادگی اے عمر رفتہ میری نادانی
کہ تجھ کو ہمرکاب و ہم عناں و ہم سفر جانا

لیا ہے میں نے ملک خاکساری کو تواضع سے
اسی انداز سے جھکنے کو شمشیر کمر جانا

شعاع ورنگ کو سرگم میں سمجھا ساز ہستی کی
تماشائے جہاں کو نغمہ تار نظر جانا

یہ کس دھوکے میں جان اپنی دئے دیتے ہیں پروانے
انہوں نے شمع کے شعلہ کو شاید تاج زر جانا

ذرا سی آبرو جو قطرہ شبنم سے بھی کم تھی
سنا جو ہر شناسوں نے اسے آب گہر جانا

مصائب بھی جہاں کی بے ثباتی ایسے نظر آئے
کہ میں نے آفتاب حشر کو شمع سحر جانا

مجھے وارفتگی پر تشنہ عرفاں کا تھا دھوکا
جسے تجھ سے بے خبر دیکھا اوسی کو باخبر جانا

[1] سرگم کے سات سُر جس طرح ساز سے نکلتے ہیں اسی طرح شعاع کے سات رنگ تار نظر پر چڑھتے اترتے ہیں۔

نہ کام آئی ہماری عقل تو کیا تیرے جلوہ کو
بانداز دِگر دیکھا بہ عنوانِ دِگر جانا

بنایا رنج و راحت کو جو توام میرے خالق نے
انہیں دو نعمتوں کو میں نے بھی شیر و شکر جانا

خزانہ سے کہیں بڑھ کر ہے استغنا طبیعت کا
کہ پایا کم سے کم تو بیشتر سے بیشتر جانا

ضرر پہنچا نہ مجھ کو آن کر اس بھڑ کے چھتے میں
کہ میں نے نوش کو بھی نیش بلکہ نیشتر جانا

دکھائے چاند رخساروں پہ چھلوں نے جو گھونگر کے
منجم نے اسی کو فتنۂ دورِ قمر جانا

فنا کی منزلوں میں ساتھ کافور و کفن بھی تھا
اسے رختِ سفر سمجھا اسے گردِ سفر جانا

جہاں میں اس طرح سے اپنی زیرِ آسماں گزری
کہ اس کو رہگذر۔ اس کو غبارِ رہگذر جانا

روانی عمر کی دیکھی کبھی گردش ستاروں کی
تبسم برق کا اس کو اسے رقصِ شرر جانا

مثل ہے نظم جو سویا وہ کھویا حب حال اپنے

شب قدر آج ہی تھی ہم نے یہ وقت سحر جانا

(۱۱)

ادائیں سادگی میں کنگھی چوٹی نے خلل ڈالا
شکن ماتھے پہ ابرو میں گرہ گیسو میں بل ڈالا
کھلے دو پھول نیلوفر کے آنکھیں اس نے جب کھولیں
ستم کیسا کیا شرما کے ہاتھوں سے جو مل ڈالا
نہ اگلی سی محبت ہے نہ اگلی سی مروت ہے
الٰہی خیر وہ انداز ہی اب تو بدل ڈالا
تمھاری بزم میں آ کر نہ کچھ کہتے بنی ہم کو
گلا نالے نے گھونٹا سینہ شکایت نے مسل ڈالا
فلک کو دیکھ کر شکوہ کریں ہم یہ ارادہ تھا
کہا جھک کر فلک نے سر اٹھایا اور کچل ڈالا
جدا ہے پاؤں سے زنجیر تیغ دور ہے سر سے
رفیقان کہن میں تفرقہ خوب اے اجل ڈالا
نہ یہ دیکھا فلک نے کون سرکش کون ہے عاجز
گیہوں کے ساتھ اس نے آسیا میں گھن بھی دل ڈالا
شکن ماتھے پہ آئی اب بھلا کیوں رخ لگے کرنے

تعلی بڑھ گئی موباف جو پہلے پہل ڈالا
موذن کی خوش آہنگی بے ہنگام تو دیکھو
شب عشرت میں ان حضرت نے ناحق کو خلل ڈالا
بنایا غیر کو اس نے نشانہ اپنے پیکاں کا
کسی نے چاہنے والے کا دل چٹکی سی مل ڈالا
علائق میں پھنسا کیوں جلوہ گاہ قدس سے آکر
بتا اے نظم آخر بھیس کیوں تو نے بدل ڈالا

(۲۰) (۱۴)

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیل

وہ دیکھو روند کر مدفن کسی کا
چھلاوا بن گیا توسن کسی کا
نہ کرنا منہ شکار افگن کسی کا
نہ رکھنا تسمہ گردن کسی کا
وہ آنا پھیر کر چتون کسی کا
وہ سر پر گوشۂ دامن کسی کا
نگہ ہنگامہ برہم زن کسی کی
تبسم صاعقہ افگن کسی کا
چھری پھیریں گے یہ ابرو کسی کے
کرے گی خون یہ چتون کسی کا
اٹھے اس بزم میں صدہا گرو بنکر
نہ پہونچا ہاتھ تا دامن کسی کا
ستاروں کا بچھونا کہکشاں ہے
گیا ہے لوٹتا دامن کسی کا
کسی کے قصر پر کیوں کیجئے رشک
سرا ہے یہ نہیں مسکن کسی کا

دیا وہ گز کفن گردوں نے وہ بھی / ڈھکا جس سے نہ وہ دن تن کسی کا
کوئی ہے کینہ جو اپنے لئے ہے / تجھے کیا تو نہ ہو دشمن کسی کا
نہ پوچھو فاتحہ پڑھنے کا انداز / وہ نازک ہاتھ تھا اور مدفن کسی کا
غبار کاروان بیخودی ہوں / نہ رہبر ہوں نہ میں رہزن کسی کا
چڑھوں میں عرش پر کیوں ہاں چکا ہے / پتا قرب رگ گردن کسی کا
گنہ کوئی کری بزم میں ٹھہروں / کسی سے دل نہ ہو بدظن کسی کا
درازی زلف کی ہے روز افزوں / لہو پیتی ہے یہ ناگن کسی کا
مجھے چاک قبائے گل نے مارا / یونہیں نکلا تھا پیراہن کسی کا
دکھایا میں نے آئینہ تو بولے / ستم ہے آج تو جوبن کسی کا
زوال حسن پیری سے ہے ہیچ باقی / ڈھلا سا پیچ میں ہے جوبن کسی کا
زہے رحمت پسند آئی جو اس کو / سر سجدہ خم گردن کسی کا

ز خود رفتہ ہی تجلی آج اے نظم
اسے کیا مل گیا خرمن کسی کا

(۱۳۳) (۱۳)

فعولن فعولن فعولن فعول

پڑے معرکے سی ہے آیا ہوا / لہو میں ہے آنسو نہایا ہوا
گہر ہے کہ صبح بناگوش میں / ستارہ سا ہے جھلملایا ہوا

وہ عنقا نظروں سے اوجھل بھی ہے
پھر آنکھوں میں بھی ہے سمایا ہوا

نہ لے بیر تو مجھ سے تو لے نہیں
کہ میں ہوں فلک کا ستایا ہوا

سزاوار رحمت ہوں میرا کریم
کہ آیا ہوں تیرا بلایا ہوا

غضب کی تھی میدان محشر میں دھوپ
گناہوں کی ظلمت نے ستایا ہوا

نظر جب سے آئی ہے زلفِ سیاہ
اندھیرا ہے آنکھوں میں چھایا ہوا

جنوں میرے تن کی طرح ہے سوار
اجل کی طرح دل ہے آیا ہوا

خوشی میں نے تیری بہر حال کی
خفا مجھ سے اپنا پرایا ہوا

رہائی خودی سے نہ ممکن ہوئی
یہ پہرا ہے کس کا بٹھایا ہوا

چمکتا ہے ایسا وہ کندن سا رنگ
کہ سونا ہو جیسے گلایا ہوا

چھڑکتے ہیں وہ اس پر اوسی گلاب
کہ جاتا ہے ہوش آیا ہوا

میری نظم کا ہے دلوں پر اثر
یہ سکہ ہے اپنا بٹھایا ہوا

(۱۹) (۱۴)

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

ایک سے ایک اس قدر افگن کا احساں بڑھ گیا
تیر سے دل بڑھ گیا پھر دل سے پیکاں بڑھ گیا
لے کے مشتاقوں کو شوقِ بزمِ جاناں بڑھ گیا

مضطرب سی مضطرب حیراں سے حیراں بڑھ گیا
بڑھتے بڑھتے کس قدر طومارِ عصیاں بڑھ گیا
چند دفتر قصۂ خوابِ پریشاں بڑھ گیا
سر ندامت سے جھکانے کا بھی موقع اب نہیں
گھٹنوں گھٹنوں تھا جو پانی تا گریباں بڑھ گیا
بحرِ تلاطم میں تھی خود بھی کشتیِ عمرِ رواں
دل کے پیچھے پیہم وحشت کنے سی بھی طوفاں بڑھ گیا
روز کی بیداد اے چرخ اور اک عالم کی آہ
دیکھنا اک دن چراغِ مہرِ تاباں بڑھ گیا
سامنے دونوں کے تھا میداں ہوائی وصل کا
رہ گئی پیچھے تمنا اور رہِ ہجراں بڑھ گیا
دیدۂ خورشید صبح و شام ہو جاتا ہے سرخ
کس قدر اس عہد میں آشوبِ دوراں بڑھ گیا
آرزو یہ تھی کہ آ جائے گلے میں تیرے ٹھیک
ایک ہی شب میں مہِ نو کا گریباں بڑھ گیا
یہ تو جی بار بار آنکھیں اسے ڈھونڈا کریں
برق سے بھی غمزۂ عمرِ گریزاں بڑھ گیا

نعمتِ خلت کا جب سے ذوق میرے دل کو ہے
خوانِ ابراہیم پر اک اور مہماں بڑھ گیا
تیرا شیوہ دل فریبی کا بہت مشہور تھا
جاں ستانی کا بھی اب تو ساز و ساماں بڑھ گیا
اہلِ کشتی کو مسرت ہے چلی بادِ مراد
نامرادی کہہ رہی ہے اور طوفاں بڑھ گیا
ہو گا خود ساماں پیدا چاہیئے کچھ دل میں جوش
شورشِ فریاد سے پر چھوں نیستاں بڑھ گیا
سچ یہ ہے جس روز بسم اللہ مکتب میں ہوئی
دودھ تیرا اس دن اے طفلِ دبستاں بڑھ گیا
تھا یہ کس کی قبر کا سبزہ کہ جس کو دیکھ کر
پاؤں پھیلانے میں دامن سے گریباں بڑھ گیا
عہدِ پیری میں ہوا روشن بیانی کو فروغ
صبح ہوتے جلوۂ شمعِ فروزاں بڑھ گیا
ابن مریم ایک ہی ٹھوکر لگا کر رہ گئے
سو قدم ان سے مرا عیسیٰ دوراں بڑھ گیا
یا فہرہ اے نظم مصرع ناسخ مغفور کا

سو چمن آگے مرا سروِ خراماں بڑھ گیا

(۱۵) (۱۱)

ساقیا خالی نہ جائے ابر یہ آیا ہُوا
ہو رہے ہیں سرخ شیشے دل ہے للچایا ہوا
داغ دل چمکا جو اس کے طالب دیدار کا
جھلملاتا ہے چراغ طور شرمایا ہوا
عاشقوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہو کیا محشر میں بھی
دھوپ میں پھرنے سے ہے کچھ رنگ سونلایا ہوا
دل بھی ٹوٹا بلبل ناشاد کا پھولوں کے ساتھ
دامن گلچیں میں اک غنچہ ہے کمھلایا ہوا
کشمکش میں آرزوئے قتل نکلے کس طرح
مضطرب میں بھی ہوں قاتل بھی ہے گھبرایا ہوا
آج پھر ناصح وہی چلتا ہوا فقرہ کہا
بارہا کا جو کہے ارشاد فرمایا ہوا
دیکھے تسکیں اس نے اعجاز مسیحائی کیا
رہ گیا قالب میں دم ہونٹوں تلک آیا ہوا
بام پر وہ جلوہ فرما ہے مقابل کون ہو

چاند کچھ دب دب کے نکلا بھی تو شرمایا ہوا
سرو و سنبل دیکھتے ہی خاک میں مل جائیں گے
بال یہ بکھرے ہوئے چلنا یہ اٹھلایا... ہوا
ابر تو آیا بھی ساقی اور برس کر کھل گیا
میری آنکھوں میں اندھیرا رہ گیا چھایا ہوا
کل تلک منہ ڈھانک کر سوتے میں دم گھٹتا تھا نظم
آج داماں کفن منہ پر ہے ڈھرایا ہوا

(۲۱) (۱۶)

بسکہ سیلاب بر فنا دار صحن ثابت ہوا
بلبلہ پانی کا یہ چرخ کہن ثابت ہوا
نقش باطل جب خیال ما و من ثابت ہوا
دہر میں انسان آوارہ وطن ثابت ہوا
کہتی ہیں تیری نگاہیں تجھ پہ خون بے گناہ
او قدر انداز ناوک فگن ثابت ہوا
جب ہوا چلتی ہے نرگس کی جھپک جاتی ہے آنکھ
برق خاطف شعلہ رنگ چمن ثابت ہوا
منہ چھپا لینے کا ساماں ہوگیا محشر میں بھی

یوں اڑی رنگت کہ دامانِ کفن ثابت ہوا

رات کو یہ وہم تھا سے عارضِ روشن پہ تل
صبح کو وہ نقشِ برگِ یاسمن ثابت ہوا

سمجھے تھے دلدار و دلسوز و دل آرام اس کو حیف
دلفریب و دلربا و دل شکن ثابت ہوا

دل میں تیرے تو لگا کر تیغ ٹھنڈک پڑ گئی
کچھ گنہ میرا نہ اے شمشیر زن ثابت ہوا

اب کہے ہی فصل جنوں میں ناتوانی اس قدر
پیرہن اپنا نہ اپنا پیرہن ثابت ہوا

ہم تو جینے ہی کو سمجھے تھے کہ مشکل ہے بہت
جان دینا بھی نہایت ہی کٹھن ثابت ہوا

دوش پہ بکھرے جو گیسو یہ بھڑک کر رہ گیا
دل اسیرِ دامِ زلفِ پرشکن ثابت ہوا

سرخ اس کافر کی پیشانی پہ قشقہ کھینچ کر
خون گردن پر تیری اے برہمن ثابت ہوا

جی لگیا آنے سے اس کے مر گیا جانے سے میں
مجھ پر اس میں ارتباطِ جان و تن ثابت ہوا

اس جہاں میں لوگ کہتے ہیں کہ تن ثابت نہیں
میں یہ کہتا ہوں کب اُس عالم میں تن ثابت ہوا

سختیاں جھیلے نہ کیوں انسان دنیا کے لئے
کوہکن پہ کب فریب پیرزن ثابت ہوا

شوق میں اس جا وہ گر کے مہر عالمتاب بھی
مثل اک ذرہ کے آوارہ وطن ثابت ہوا

زلف و قد کا تھا جو سودا خون ہو ہو کر بہا
دل ہمارا کشتہ دار و رسن ثابت ہوا

جھک پڑی چہرے پہ لہرا کر جو زلف پرشکن
شاخ سنبل کا ثمر سیب ذقن ثابت ہوا

قہر ڈھایا جب اٹھا مظلوم کے دل سے دھواں
ایک مور ناتواں بھی پیل تن ثابت ہوا

سر پہ تیشہ طرہ خسرو کا دیتا ہے جواب
آج اے فرہاد تیرا بانکپن ثابت ہوا

وقت بد میں ہر طرف سی شکلیں ہوتی ہیں نظم
آئینوں میں جا بجا سورج گہن ثابت ہوا

(۱۷) ولہ

آپ کی محفل میں آ کر دل مکدر لے چلا
آئینہ لایا تھا میں سدِ سکندر لے چلا

دیدۂ تر لے چلا اشکوں کی چادر لے چلا
میں جدھر اٹھا بسان موج بستر لے چلا

دل صفِ مژگاں کی جانب سو مکدر لے چلا
میں بھی سہرہ کی طرح سے گردِ لشکر لے چلا

سامری ہے سحر کو پھر زندہ کرنے کے لئے
آ کے مٹی تیرے قدموں کی فسونگر لے چلا

روزِ محشر میری از خود رفتگی دیکھو ذرا
خود اسی کے سامنے شکووں کا دفتر لے چلا

نیند میں تجھ کو بھی آخر کچھ خبر ہے یا نہیں
آہو آنکھوں سے تری کاجل چرا کر لے چلا

آ کے میخانہ میں ہم مستوں کو پہلے لوٹ لے
کس طرف او ابرِ دریا بار لشکر لے چلا

دیکھنا صبح شب عیش اس کے گیسو کی شمیم
مٹھیاں بھر بھر کے باسی ہار عنبر لے چلا

زلف برہم ہو گئے او لجھی چٹکیاں مشکل نے لیں

بوسہ مجھ سے چھین کر بندے کا گوہر لے چلا

میں سرائے دہر میں ٹھہرا تھا مثل ابر و برق

کروٹیں دو چار ابھی باقی تھیں کہ بستر لے چلا

میری پلکوں سے روانی اشک خوں کی دیکھ کر

ابر تر آ کر رگ سودا پہ نشتر لے چلا

ہم رہے محروم حسن و عشق کے دربار سے

طوق قمری لے چلی طرہ صنوبر لے چلا

بھا گئی ہم کو یہ تیری سیر چشمی اے حباب

آن کر دریا میں بھی خالی ہی ساغر لے چلا

میں تو سمجھا تھا عدم سابق بھی ہے لاحق بھی ہے

ہائے پھر ہستی کی تہمت کیوں لگا کر لے چلا

میں ہمہ تن آہ و نالہ خواب مرقد سے اٹھا

استخواں ہر ایک اپنا صور محشر لے چلا

کاروان گل چلا آخر ہوئی فصل بہار

سبزہ خود رو چمن سے اپنا بستر لے چلا

وقت آخر آشکارا ہو گئے سب دل کے داغ

خود میں اپنی قبر پہ پھولوں کی چادر لے چلا

بو شگوفوں سے نکل آئی گریباں پھاڑ کر
باغ کو جوشِ جنوں جامہ سے باہر لے چلا
عفو کا خلعت گناہوں کی ندامت پر ملا
نذر دینے اشک جو لایا تھا گوہر لے چلا

(۱۸) — ولہ — (۲۱)

آج محشر میں بھی ہوں تشنہ تری بیداد کا
میں گلا گھونٹوں خیال آئے اگر فریاد کا
دل کو ٹکرے تو سہی ظالم ملا کر مجھ سے آنکھ
منہ ذرا دیکھوں تو میں ترکِ ستم ایجاد کا
لاش پر میری اگر آجائے وہ وعدہ خلاف
اتنا کہدینا کہ کیا کہنا تمہاری یاد... کا
جانتے ہو پوچھنے سے حالِ دل ہوتا ہے رنج
نام کیوں لیتے ہو پھر اُس خانماں برباد کا
تھامنا مجھ کو یہی ہے کوئے قاتل کی زمین
ہر قدم پر سامنا ہونے لگا افتاد کا
ظلم سہ سہ کر بنایا خود اسے سنگاکِ خلق
داورِ محشر سے منہ پڑتا نہیں فریاد کا

نہر پر لہرا رہا ہوں میں بطا مے کے لئے
ڈھل گیا دن وہ رہا تک سایہ گیا شمشاد کا

وہ جوانی کے مزے وہ جھگڑے وہ وصل و ہجر
شعبدہ یہ بھی تھا ایک اس چرخ بے بنیاد کا

عشق کا عالم نظر آتا ہے عالم ہی نیا
ہے زمیں افتاد کی اور آسماں بیداد کا

کون سنتا ہے میری فریاد اس کو دیکھ کر
پڑ گیا غل اہل محشر میں مبارک باد کا

اب نہ گلشن ہے نہ اپنے آشیانہ کا پتہ
کچھ بگولہ اٹھ گئے دنیا ہے نشاں صیاد کا

میں ابھی محو سراپا تھا کہ رات آخر ہوئی
وصل کی شب میں تھا عالم سایۂ شمشاد کا

چہرہ اترا ہی چلا جاتا ہے اس کا شرم سے
کام کرتی ہے نزاکت مانی و بہزاد کا

تیر جستہ ہوں میں غربت سے سدا اپنا وطن
جس جگہ جا مل گئی بستر ہوا آزاد کا

رہ گیا اپنا سا منہ لیکن ہیں شوق قتل میں

خنجرِ قاتل مجھے آئینہ تھا فولاد کا
ہائے کیا سہما ہوا تھا نالۂ مرغِ چمن
رہ گیا بن کر چراغ ایک خانۂ صیاد کا
لشکرِ بادِ بہاری اور جنوں کی کشمکش
گل کا نکلا پیرہن شانہ چھلا شمشاد کا
شیخ کو جھک ہے کہ سمجھائے مجھے شکلِ عروس
ذہن میں لاؤں کہاں سے بات قدِ داماد کا
دیدۂ فتاں نے مارا ہے کوئی پرساں نہیں
اس ستم اس قہر اس اندھیر اس بیداد کا
اے فلک اس گردشِ بیجا سے کیا حاصل ہوا
شاد کرنا بھی تجھے آیا کسی ناشاد کا
پاس میرے تم کو تو آتا نہیں یک دم قرار
ہے تعجب دل میں رہ جانا تمہاری یاد کا
نظم نے آخر گوارا کر لیا داغِ فراق
دل پہ رکھا ہاتھ دامن چھوڑ کر جلاد کا

ہرزہ گردی سے عدم سے یوں ہی تو میں پیدا ہوا

داغ سے دل درد سے اپنا جگر پیدا ہوا

وہ کھلیں کلیاں وہ جھکے پھول دے جلدی شراب
وہ ہوا آئی وہ ساقی ابرِ تر پیدا ہوا

عشق کا تیرا اسی دن سے ہے میرے دل میں داغ
پرتوِ خورشید سے جس دن قمر پیدا ہوا

خون اسی دن سے جگر میرا ہے دل بیتاب ہے
جب حنا میں رنگ پتھر میں شرر پیدا ہوا

ہر گھڑی لپٹائے رہتا ہوں کلیجہ سے اسے
دوسرا معشوق یہ داغِ جگر پیدا ہوا

دل کو بھی آخر مرے عادت اولجھنے کی ہوئی
گیسوئے پیچاں کی صحبت کا اثر پیدا ہوا

میں نہ کہتا تھا کہ گلشن میں نہیں جائیں حضور
نالۂ بلبل سے آخر دردِ سر پیدا ہوا

ہاتھ پھیلانے میں شکلِ برگ کچھ حاصل نہیں
دیکھ غنچہ کی طرف مٹھی میں زر پیدا ہوا

آتش افروزی یہ کی کس طالبِ دیدار نے
طور جل کر رہ گیا ایسا شرر پیدا ہوا

مرتبہ رکھتی ہے اسے زاہد سیہ کاری مری
ابر رحمت سے مراد امانِ تر پیدا ہوا

میری آنکھوں میں جہاں سارا تجلی زار تھا
نخلِ ایمن اس کو سمجھا جو شجر پیدا ہوا

آپ سے باہر ہوئے جس دم تو پایا دوست کو
اپنا گھر چھوڑا تو اس کے دل میں گھر پیدا ہوا

میری مٹی میں نہاں ہیں مثلِ اخگر سوز شیں
خاک جب سر کی ذرا داغ جگر پیدا ہوا

طور خاکستر ہوا ہے قوم موسیٰ کے لئے
نا حقیقت بیں جو تھے کحل البصر پیدا ہوا

ہو چکی طے راہ ہستی جھک گیا اب قدِ راست
شکر ہے ملکِ عدم کا نظم در پیدا ہوا

۱۹ — ولہ — ۲۰

ہم فقیروں کا ٹھکانہ بھی کہیں ہو جائے گا
جام ہمدم شیشۂ مے ہمنشیں ہو جائے گا

آکے میخانہ میں جو عزلت گزیں ہو جائے گا
دورِ گردوں اس کو دور ساتگیں ہو جائے گا

راستی گر چاہتا ہے کر تواضع اختیار
سید ھا اک سجدہ زیں لے نقش نگیں ہو جائے گا
دل کو روشن کر اگر ہے نیش زن زنبور غم
چاندنی راتوں میں پیدا انگبیں ہو جائے گا
بار عصیاں روز لے جایا کریں گے گر ملک
دبتے دبتے آسماں آخر زمیں ہو جائے گا
لے چلی تختِ رواں سے خاک مدفن میں قضا
دیدۂ مور اب سلیماں کا نگیں ہو جائے گا
پہلے اپنی بات کا پیدا تو کر لے اعتبار
پھر اگر جھوٹوں بھی کہدیگا یقیں ہو جائے گا
کچھ تو رہنے دے قیامت کیلئے بھی اے فلک
کیا عذابِ حشر سب مجھ پر یہیں ہو جائے گا
خود نمائی اس قدر منبر پہ واعظ خیر ہے
ناز یہ کرنے سے کیا تو نازنیں ہو جائے گا
خامہ و ذہنِ رسا کا روز افزوں ہے کمال
وہ تو صورت گر یہ معنی آفریں ہو جائے گا
تو ستارہ کو مرے اے پستیِ طالع نہ کھینچ

آسماں کا آسماں زیر زمیں ہو جائے گا

آنکھ میں اک رس ہے لیکن شرط ہی طرز نگاہ
زہر ہو جائیگا یا یہ انگبیں ہو جائے گا

کچھ دنوں نوکِ مژہ کاوش اگر کرتی رہی
نام تیرا نقش دل میرا نگیں ہو جائے گا

بزم میں بے تیرے پہنچائیگا ساغر چشم زخم
خط پیمانہ نگاہِ نکتہ چیں ہو جائے گا

بحث رندوں سے نہ کر جا جاکے واعظ اسقدر
کیا رہے گی پھر اگر ملزم کہیں ہو جائے گا

تجھ سے اٹھیگا بھلا پھولوں کے اس گہنے کا بوجھ
قدِ موزوں رشکِ شاخ یاسمیں ہو جائے گا

پھر ذرا تم مڑکے دیکھو تو سہی زندہ۔ ابھی
کشتۂ تیر نگاہِ سرمگیں ہو جائے گا

زلف گرہو کر پریشاں کروٹوں میں آگئی
کھاکے بل ہوئے کمر بھی عنبریں ہو جائے گا

دردِ دل کا نظمؔ کو رہتا ہے رونا روز روز
جان سے بیزار اک دن ہمنشیں ہو جائے گا

٢١

دل نے پھر وارفتۂ حسنِ بت پرفن کیا
اشکِ خوں نے پھر چراغِ آرزو روشن کیا

چھوٹ کر تیر اس کی چٹکی سے یہ دیتا ہے صدا
آفریں کیا کام تو نے اے شکار افگن کیا

بوسے لینے کا تھا کلیوں کے چٹکنے پر جو وہم
شرم سے پھر منہ نہ اس نے جانبِ گلشن کیا

گھل کے کاجل نے کیا آنکھوں کو نیلوفر کا پھول
جم کے مسّی نے لبوں کو غیرتِ سوسن کیا

شمع میں تو آج کی شب روشنی مطلق نہ تھی
تو نے آ کر خانۂ تاریک کو روشن کیا

بعد مرنے کے بھی میں ایسا ہوں دشمن کامِ خلق
شمع نے گریہ نہ اک دن بھی سرِ مدفن کیا

ہے نگاہِ یار شوقِ روزنِ دیوارِ یار
مثلِ دیوار اس نے دل میں بھی مرے روزن کیا

کون سنتا ہے فغانِ درویش کی ہم نے تو نظم
آہ کی فریاد کی نالہ کیا شیون کیا

۲۲

اس نے دکھلا کے جھلک اپنی جو دیوانہ کیا
تو نے حیرت زدہ حسن کو دیوانہ کیا

منزل دہر نہیں چھاؤنی چھانے کا مقام
خاک میں مل کے یہاں نشو و نما ہوتا ہے

سارے عالم کو بنایا ہدف تیر اجل
آج گردوں نے کیا شہرہ آفاق جسے

کم نہیں دل سی تڑپنے میں سویدا دل کا
پھرنا آنکھ کا عشوہ نے سکھایا مجھ کو

اس کے تو سلسلہ زلف میں آوارہ نہیں
سادگی آگئی جس دن ہو گیا عہد شباب

الحذر ظلم بہت جھک کے فلک ملتا ہے

۱۱

طور پر جا کے ادا سجدہ شکرانہ کیا
آئینہ کو ترے جلوہ نے پریخانہ کیا
وہی عارف ہے گذر جس نے فقیرانہ کیا
سبز موتی کا نہ بارش نے کوئی دانہ کیا
قدر انداز نے یہ شغل صنمانہ کیا
کل اوسے محفل احباب کا افسانہ کیا
اسے اسپند بنایا اسے پروانہ کیا
اس میں پیدا اثر گردش پیمانہ کیا
گوش زد یار کے کس نے میرا افسانہ کیا
پھر کبھی آئینہ دیکھا نہ کبھی شانہ کیا
خوف کی بات ہے دشمن نے جو یارانہ کیا

۲۳

کھینچے آئیگا سینہ سے جو پیکاں اپنا
اٹھ گئی کشتی مے بزم سے ہنگام سحر
اڑ کے جاتی ہے مری خاک ادھر گاہ ادھر
حشر کے دن بھی میں ہر ایک کا منہ تکتا ہوں

۱۶

پھر بچانا تجھے مشکل ہے گریباں اپنا
دن چڑھا تخت اڑا لے گئیں پریاں اپنا
کچھ بتا دے نہ گئی عمر گریزاں اپنا
کوئی اب بھی نظر آتا نہیں پرساں اپنا

ہوں وہ شوریدہ کہ ہو جوں کی طرح پیدا دریچے
چاک ہوتا ہے گریباں پہ گریباں اپنا

کہیں پیا تو ہو روز سیہ پیش آئے
نہ کہیں رنگ جمائے شب ہجراں اپنا

کی جو اخگر کی طرح گرد کدورت پیدا
مل گیا خاک میں آخر دل سوزاں اپنا

بس کہ تحصیل ادب ادبوں سے ہے مجھے
ہے خرابات زمانہ میں دبستاں اپنا

دل یہ کہتا ہے کہ پھر فصل جنوں آئی ہے
خود بخود چاک ہوا ہے جو گریباں اپنا

اپنے ہی پاؤں میں چبھتے ہیں جو بوئے کانٹے
اپنے ہی سر پہ ہوا کرتا ہے احساں اپنا

جوش وحشت میں بھی پابند قناعت ہیں
اپنے دامن کو سمجھتا ہوں بیاباں اپنا

اس نے سو مرتبہ شب بھر میں سنوارے گیسو
آئینہ اس کا رہا دیدۂ حیراں اپنا

روز محشر کی بھی ایذائیں اٹھا لوں گا مگر
نہ دکھانا مجھے ای شب ہجراں اپنا

سر بہ زانو ہوئے جب آپ میں ہی تھے نہیں ہم
جادۂ دشت ہے ہر بخیۂ داماں اپنا

لی خبر حضرت ناصح نے بڑی دیر کے بعد
چڑھ چکا تربت مجنوں پہ گریباں اپنا

وہ زمانہ بھی زمانہ تھا عجب اے حبیب
آشیانہ اپنا تھا گل اپنے گلستاں اپنا

۴۳ —————— ۱۴

ہے ستم ہر چمن شور مچانا تیرا
آہ ہر دل پہ ہے نمک ریز ترانہ تیرا

کبھی یاد آتا ہے جو بھولے سے بھی آنا تیرا
یاد آتا ہے شب غم میں رلانا تیرا

کس کا شکوہ کروں کس کا گلہ کروں مشکل ہے
آسماں تیرا نہیں تیری زمانہ تیرا

ہے فلک غضب ہوں آگاہ روش سے تیری
جانتا ہوں کہ رلائے گا ہنسانا تیرا

حوصلے رہ گئے ای فصلِ جوانی افسوس
ولولے دل کے سوا کم ہے زمانہ تیرا

غمزدہ درد رسیدہ ہوں میں ای شمع مزار
دل دکھاتا ہے مرا اشک بہانا تیرا

یوں نگہ پھیر لے وہ آنکھ ملا کر مجھ سے
ای اجل خوب سمجھتا ہوں بہانا تیرا

حال کھل جائیگا آنے دے بہار ای بلبل
بے اثر ہیں مرے نالے کہ ترانہ تیرا

بے مروت کوئی پھر تجھ سے ملے کس دل سے
آج تک یاد ہے وہ دل کا دکھانا تیرا

اے جنوں سچ ہے گلا کاٹ کے مر جانا تھا
خوب رسوا ہوئے کہنا جو نہ مانا تیرا

حسرت تیر انہیں بھی ہے جو ہیں بے پر و بال
جب سے دیکھا ہے نشانہ کو اڑانا تیرا

تیر لگتا ہے کلیجہ پہ کبھی دل پہ کبھی
ٹھیک پڑتا ہی نشانہ پہ نشانہ تیرا

مسکرائے جو شگوفے تو بہت رویا میں
ہونٹ تیرے مجھے یاد آئے ہنسانا تیرا

تا کجا شرح غم و درد خدارا حیدر
ہچکیاں لگ گئیں سن سن کے فسانہ تیرا

۲۵ — ۱۳

مژدہ اے بادہ کشو ابر بہار آ پہنچا
کوہ سے جھوم کے اٹھا لب دریا پہنچا

ہاتھ ملتے رہے سب اسکی دل آزاری پر
نہ گریباں تلک ہاتھ کسی کا پہنچا

چاند کو دیکھ کے طالع شب تنہائی میں
میری آنکھوں میں امنڈتا ہوا دریا پہنچا

خط جو اب اسنے لکھا بھی تو لکھا صاف جواب
بعد مدت کے یہ تقدیر کا لکھا پہنچا

دوستو بہر خدا چھوڑ کے مرقد میں مجھے
اس طرف بھی کوئی بھولا ہوا غمخوار آ پہنچا

خاک مرقد میں وہ ہی جذب کہ تم سن لینا
گرتا پڑتا اسی منزل پہ مسیحا پہنچا

گوشہ گیری کو وہ اللہ نے شہرت دی ہے
کہ نہ اس کے پر پرواز کو عنقا پہنچا

چاہتا ہی نہ رہے خواب گران غفلت
دل پر ایک زخم لگا زخم کو ایذا پہنچا

اس کے درباں نے کہا دیکھ کے زنداں مجھے
دیکھ لینا کہ چھٹا اور یہ سیدھا پہنچا

جلوہ شاہد معنی ہے حریم دل میں
آنکھ جب بند کی مانند نظر جا پہنچا

شانہ گیسو میں جو الجھا تو وہ مجھ ہی سے الجھے
پڑ گئے زلف میں بل ہاتھ کو جھٹکا پہنچا

شب غم میں ملک الموت کا آنا دیکھو
شکر ہے شکر اس آفت میں یہ جیتا پہنچا

مسند فقر کا اپنی ہے وہ رتبہ اے نظم
نہ تو قیصر اسے پہنچا نہ تو کسری پہنچا

۲۶ ——— ۱۱

دل کا طالب وہ ہوا جان کا خواہاں نہ ہوا
وہ ہوا درد کہ جس کا کوئی درماں نہ ہوا

قائل مہر و وفا دشمن ایماں نہ ہوا
ہائے کافر کو نہ ہونا تھا مسلماں نہ ہوا

کب سر زلف سیہ سلسلہ جنباں نہ ہوا
حیف وہ دل کہ حریف خم چوگاں نہ ہوا

ہم کو حاصل یہ ہوا پھونک کے خرمن اپنا
برق کہتی ہے کہ تنکے کا بھی احساں نہ ہوا

ہو گیا سانحہ اپنا بھی عجب عبرت خیز
مفت میں جان بھی دی یار پشیماں نہ ہوا

دل کا سب راز ہی عنوان جبیں سے ظاہر
لاکھ لاکھ اس کو چھپایا کبھی پنہاں نہ ہوا

حلقۂ دل زدگاں میں تھا گذر ناصح کا
آج اس بزم میں وہ فتنۂ دوراں نہ ہوا

ڈھا دیا دست اجل نے تو قضا نے لوٹا / کاغذ باد ہوا تخت سلیماں نہ ہوا
ساری عالم کا تو معشوق تھا اے حسن شباب / کس کا گیسو ترے ماتم میں پریشاں نہ ہوا
نہ مزاج آپ نے پوچھا تو گلہ مجھ کو نہیں / شکر کرتا ہوں کہ شرمندۂ احساں نہ ہوا

فکر پاداش نہ کچھ شرم گناہ حیف اے نظمؔ
سر بہ زانو نہ ہوا سر بہ گریباں نہ ہوا

۲۷ — ۱۴

مختصر مرحلۂ طول امل کیا ہوگا / قطع یہ سلسلہ بے تیغ اجل کیا ہوگا
آج کچھ ہو نہیں سکتا ہے تو کل کیا ہوگا / سر پہ جب آن ہی پہنچے گی اجل کیا ہوگا
دور کر تیرگی دل کہ ابھی تک ہے وقت / ہو گئی صبح تو روشن یہ کنول کیا ہوگا
حرکت چرخ کی بس تیرے ہی آہنگ سے ہے / ورنہ بے صوت حدی رقص جمل کیا ہوگا
چاہیے گوشۂ دل وادی ایمن ہو نہ طور / جلوہ زار اس کا بھلا دشت و جبل کیا ہوگا
ہاتھ میں چوم لوں زاہد ترے پہلے یہ بتا / میری بخشش کا سبب تیرا عمل کیا ہوگا
دیکھ کر زخم جگر کو مرے کہتا ہے رقیب / جس کا یہ پھول ہے اس تیغ کا پھل کیا ہوگا

قطعہ

دیکھتا ہوں کبھی حسرت سے تو کہتا ہے وہ شوخ / تو مجھے دیکھ کے جلتا ہے تو جل کیا ہوگا
جب میں کہتا ہوں چلو ترک محبت ہی سہی / اس پہ وہ ناز سے کہتا ہے کہ چل کیا ہوگا
حسن نیت تو ہی زاہد کا تو معلوم / دیکھتا ہے اثر حسن عمل کیا ہوگا

بیٹھے ہیں گوشہ عزلت میں ہم اب توڑ کے پانو
ہاتھ منت کش ارباب دول کیا ہوگا
تلخ کامی کی حلاوت کو نہ پوچھو ہم سے
اس سے بڑھ کر مزۂ قند و عسل کیا ہوگا
بڑھتی جاتی ہے ہوس عمر ہے جوں جوں بڑھتی
اس کا انجام اب اے طول امل کیا ہوگا
نظم اک آئی وفانی ہے پھر اس سے ناراض
خالق لم یزل و عز و جل کیا ہوگا

۲۸ — ۱۵

سرو کی طرح اگر برزدہ داماں ہوتا
رشک فغفور نہ ہم رتبۂ خاقاں ہوتا
کاشکے پیش نظر مجمع خوباں ہوتا
مار ڈالا ہے زمانہ کی دو رنگی نے مجھے
ہم کہاں بیٹھ کے رستے میں تڑپتے تھکیں
چھپ گئے گرد میں سب قافلے والے افسوس
مرغ بسمل ہوں نہیں میری تڑپ کا علاج
حلقے مد و یر کواکب کے مسلسل رہتے
تھا وہ اس عالم اجسام کی لیتا تو کوئی
اعتبارات پہ ہستی کی بنا ہے قائم
دور تھا سوز غم ہجراں کا مجھے اے واعظ

مثل غنچہ کے نہیں سر بگریباں ہوتا
آدمی کچھ بھی نہ ہوتا اگر انساں ہوتا
اور ان میں سے کوئی جان کا خواہاں ہوتا
لاش پر بھی کوئی گریاں کوئی خنداں ہوتا
نقش پا کوئی تو اے عمر گریزاں ہوتا
اس طرح بھی ہے نظر سے کوئی پنہاں ہوتا
چاہتا ہوں کہ وہی سر وہی ساماں ہوتا
کوئی ان کا نہ اگر سلسلہ جنباں ہوتا
قطرہ میں بحر تو ذرہ میں بیاباں ہوتا
ہم نہ ہوتے تو کہاں عالم امکاں ہوتا
میں بھلا خوف سے دوزخ کے مسلماں ہوتا

دیکھ لیتا جو کسی کے یہ ستارہ کا عروج
کہکشاں سی فلک انگشت بدنداں ہوتا

تجکو ثابت قدم اے شمع سمجھتے جب ہم
سوزِ غم کی کوئی حد ہوتی نہ پایاں ہوتا

زاہدِ خشک بتا پھر تری کیا گت بنتی
کوئی میخوار اگر دست و گریباں ہوتا

دل کا ارمان نکلتا تو ہے مشکل اے نظم
دم نکلنا ہی کسی طرح سے آساں ہوتا

۲۶ —— ۱۵

آنکھ پھرنے میں جو رنجش کا نہ پہلو ہوتا
مجھ کو آہوں سے زیادہ رمِ آہو ہوتا

حسرت و درد کو کچھ اور جگہ مل جاتی
کاشکے دل سے بھی خالی مرا پہلو ہوتا

دم نکلتا بھی تو ہم ضبط ہی کرتے غمِ عشق
نیل ڈھلتا بھی تو آنکھوں میں نہ آنسو ہوتا

ہم سمجھتے کہ کیا سیماب کو کشتہ ہم نے
اگر اپنے دلِ بیتاب پہ قابو ہوتا

پیچ گھونگر نے جو ڈالے ہیں اگر کھل جائے
کچھ کمر سے بھی نکلتا ہوا گیسو ہوتا

اثرِ نگاہ رُبا دل کو ہوا ہے حاصل
پھینک دیتے بھی وہ ناوک تو ترازو ہوتا

جیسا سوائیوں کا ہے مرے رونے پہ ہجوم
ایسا میلا بھی آہی نہ لبِ جو ہوتا

دل کا بوجھ نکلتا جو کسی نالے میں
برجِ میزاں کیلئے سنگِ ترازو ہوتا

میرے نالے جو شبِ تار کو سمٹا لاتے
صبحدم چہرۂ خورشید پہ گیسو ہوتا

پُرخطر تھی شبِ ہجراں کی سیاہی ایسی
دن نکلتا بھی تو سہما ہوا جگنو ہوتا

اٹھ گئے گلزار میں صیاد کو نیند آجاتی
شاخِ نرگس پہ جگایا ہوا جادو ہوتا

ضبط گریہ بہت آسان تھا گر مشکل تھا
دل میں ناسور تو ناسور میں آنسو ہوتا

ہم دکھا دیتے رہ یوں دے کے نکلتا ہی جانا
بام پر سر کو جو نیوہڑائے ہوئے تو ہوتا

سرمہ بھی دیدۂ فتاں میں لگانا تھا ضرور
ساتھ آہو کے غبار رم آہو ہوتا

ہم سے بڑھ کر کوئی مجبور نہ ہوگا اے نظم
جان دینے پہ بھی اپنا نہیں قابو ہوتا

۳۰ —— ۱۸

جلوہ گر آنکھ میں بھی دل میں بھی پنہاں دیکھا
دیکھا دیکھا تجھے او فتنۂ دوراں دیکھا

دل کے آئینہ میں ہم نے رخ جاناں دیکھا
طور پر آپ نے کیا موسیٰ عمراں دیکھا

زیست میں چار طرف مرگ کا طوفان دیکھا
تند آندھی میں چراغ تہ داماں دیکھا

تجھ نے پایا نہ قدم طول امل کے ہاتھوں
کالے کوسوں پہ مسافر نے شبستاں دیکھا

رشک ہے مجھ کو تری جامہ دری پر اے موج
جس طرف ہاتھ بڑھا اپنا گریباں دیکھا

پاؤں ہی مور ملخ کے جو اٹھی گرد ذرا
ہیں تہ آئینہ بجذا تخت سلیماں دیکھا

دیکھا نشتر کوئی کاری تو زبان منت
دیکھا پتھر کوئی بھاری تو احساں دیکھا

عالم وجد میں کھینچا تھا ابھی دامن یار
آگیا ہوش تو اپنا ہی گریباں دیکھا

دل بھر آنے کو بہانہ ہے ذرا سا کافی
رو دئے بزم میں شیشہ کو جو گریاں دیکھا

ہم نہ کہتے تھے کہ یہ جلوہ گری خوب نہیں
معرکہ رات کا ہے شمع فروزاں دیکھا

جھوٹ ہی جھوٹ نہ جانے تھی کبھی اور یہ مشتاق
سچ تو یہ ہے کہ عجب خواب پریشاں دیکھا

قسمت دہر میں لکھی ہوئی ہے ویرانی
میں نے ہر خاک کے ذرہ میں بیاباں دیکھا

جانے والوں میں وہ دہر کو تو سمجھے لیکن
سب کے آگے تجھے اے عمر گریزاں دیکھا

تو کنارے پہ کھڑا ہو جو رہا چھوڑ کے راہ
تو نے اے سروِ چمن کس کو خراماں دیکھا

عکسِ عارض سے کسی کے یہ ہوا جوشِ صفا
آپ آئینہ سے اٹھتے ہوئے طوفاں دیکھا

یہ نہیں جانتا کیا ہجر میں گذری مجھ پر
آنکھ کھولی تو طبیبوں کو ہراساں دیکھا

قہر تھا پائے نگارین کا وہ ٹھوکر لینا
فتنۂ حشر کو بھی خون میں غلطاں دیکھا

کشتنی تھا کہ نہ تھا نظم نہ معلوم مگر
قتل کے بعد ستمگر کو پشیماں دیکھا

۳۱ ——— ۱۳

راہِ الفت میں پس و پیش یہ کب دل آیا
مثلِ آوازِ جرس کے میں دو منزل آیا

قیس نے دیکھ لیا جھانک کے لیلیٰ کا جمال
بیدِ مجنوں جو نظر صورتِ محمل آیا

کفِ افسوس ہے اپنی ہی زمانے کو سرور
اس غم آباد میں میں مثلِ جلاجل آیا

نگہِ شوق نے یہ پردہ دری کیسی کی
آخر اس شوخ کو غصہ سرِ محفل آیا

برق سی تیز کہیں ہے روشِ عمرِ رواں
جس نے اک سانس لی وہ سینکڑوں منزل آیا

مثلِ سبزہ کے نہ سرسبز ہوا نام مرا
مثلِ دانہ کے یہ جب تک تہِ گل آیا

اس سے پہلے کہ جگہ حرص بنائے دل میں
کب نظر موجِ ہوا کا کوئی ساحل آیا

کٹ گئی عمر زباں رک گئی چلتے چلتے
رشتۂ شمعِ نظر جادۂ منزل آیا

نیم جاں چھوڑ دیا مجھ کو تماشا دیکھو
رحم جلاد کو کیسا دم بسمل آیا

جان دیکر بھی نہ افسردہ ہوئے اہل کرم
ملک الموت کو سمجھے کوئی سائل آیا

نہ کسی جن کا گذر ہے نہ پری کا سایہ
تجھ پہ کوئی نہیں آیا ہے میرا دل آیا

خاکساری طلبوں کیلئے رفعت ہی عجب
دوش احباب پہ میں گور کی منزل آیا

سات پردوں کو جو آنکھوں کے اٹھایا اے نظم
مجھ میں اور اس میں نہ پردہ کوئی حائل آیا

۳۲ — ۱۱

زندگی کیا ہے اک فسانہ کا دہرایا جانا
موت کہتی ہیں کسے زیست سے اکتا جانا

یاد ہے بزم مسرت میں ترا آجانا
جلوہ حسن سے وہ شمع کا شرما جانا

مغتنم قلزم ہستی میں رہا تار نفس
ڈوبتے کیلئے تنکے کا سہارا جانا

کبھی آنے نہ دیا خاطر نازک پہ ملال
مجھ سے دیکھا نہ گیا پھول کا کمہلا جانا

دل ہے دل اس کا تحمل ہے تحمل اس کا
کوہ کو جس نے پر کاہ سے ہلکا جانا

ہم کو عبرت نہیں اس بیخبری پر اپنی
کہ طلسمات دو عالم کو تماشا جانا

نہیں معلوم کہاں آئے کہاں جانا ہے
ایسا آنا ہی نہ اچھا تھا نہ ایسا جانا

آشیانہ کے سزاوار نہ تھا پیکر خاک
طائر روح نے اک شب کا بسیرا جانا

میں نے ہر ذرہ کی آغوش میں صحرا دیکھا
میں نے ہر قطرہ کو جولانگہ دریا جانا

جنبش باد بہاری سے نکالی ہے یہ چھیڑ
برق کو ابر کے آغوش میں تڑپا جانا

کس سے پوچھا تھا پتہ کس نے بتایا اے نظمؔ
کس طرح آپ نے مے خانہ کا رستہ جانا

۳۲ ——— ولہ ——— ۱۱

تنِ خاکی میں ہے افسردہ مرا دل ایسا
کوئی دانہ ہوا آگہی نہ تہ گل ایسا

کون ہے اپنے ہوا خواہ ہو نگا قائل ایسا
شکل تو چاندی سی ہے آپکی اور دل ایسا

بھر گیا پھولوں سے دامان نظر جیب سماع
اسقدر کثرتِ گل شورِ عنادل ایسا

گور میں بھی نہیں طوفان حوادث سے مفر
موج تو ایسی بلاخیز ہے ساحل ایسا

میں سمجھتا ہوں کہ شادی کا سر انجام کیا
مل رہے ہیں کفِ افسوس جلاجل ایسا

عفو فرمائے جو ناصح تو میں اتنا پوچھوں
اس نے دیکھا ہے کوئی حور شمائل ایسا

بخش دے خلد کا گلزار وہ ایسا ہی کریم
اک پرِ کاہ کی پرسش کرے عادل ایسا

تیز رو جب تجھے اے ناقۂ لیلی سمجھیں
دیکھ لے قیس اڑے پردۂ محمل ایسا

تخم باقی نہ رہا کشت جو سرسبز ہوئی
سبزہ آتے ہی گیا رخ سے ترے تل ایسا

ہاتھ انگڑائیاں لے لیکے بڑھاتے ہیں جو رند
کشتیِ مے کیلئے چاہئے ساحل ایسا

نظمؔ نے ظلم سہے اور کبھی اُف منہ سے نہ کی
ہم نے دیکھا جگر ایسا نہ کہیں دل ایسا

۳۳ ——— فعلاتن فعلاتن فعلن ——— ۱۱

آ گیا پھر رمضاں کیا ہوگا
ہائے اے پیر مغاں کیا ہوگا

باغ جنت میں مہماں کیا ہوگا
تو نہیں جب تو واں کیا ہوگا

خوش وہ ہوتا ہے مرے نالوں سے
اور اندازِ فغاں کیا ہوگا

دور کی راہ ہے ساماں ہیں ٹرے
اتنی مہلت ہے کہاں کیا ہوگا

دیکھ لو رنگ پریدہ کو مرے
دل جلے گا تو دھواں کیا ہوگا

ہوگیا ایک نگہ میں جو تمام
وہ بہ حسرت نگراں کیا ہوگا

ہم نے مانا کہ ملا ملک جہاں
نہ رہے ہم تو جہاں کیا ہوگا

مر کے جب خاک میں ملنا ٹھہرا
پھر یہ تربت کا نشاں کیا ہوگا

جسطرح دل ہوا ٹکڑے از خود
چاک اس طرح کتاں کیا ہوگا

یا ترا ذکر ہے یا نام تیرا
اور پھر وردِ زباں کیا ہوگا

عشق سے باز نہ آنا حیدر
راز ہونے دے عیاں کیا ہوگا

۳۵ ——— متفاعلن چار بار ——— ۱۴

یہ ہوا اس حباب کا جو ہوا میں بھر کے ابھر گیا
کہ صدا ہے لطمۂ موج کی سرِ پر غرور کدھر گیا

مجھے جذب دل نے کھینچ لیا جو بھٹک کے رکھا قدم کوئی
مجھے پر لگا دئے شوق نے کہیں تھک کے میں جو ٹھہر گیا

مجھے پیری اور شباب میں جو ہے امتیاز تو اسقدر

کوئی جھونکا بادِ سحر کا تمھارے پاس سے جو گزر گیا

اثر اس کے عشوہ ناز کا جو ہوا وہ کس سے بیاں کروں

مجھے تو اجل کی ہے آرزو اسے وہم ہے کہ یہ مر گیا

تجھے اے خطیبِ چمن نہیں خبر اپنے خطبۂ شوق میں

کہ کتابِ گل کا ورق ورق تری بیخودی سے بکھر گیا

کسے تو سناتا ہے ہمنشیں کہ ہے عشق دشمن عقل و دیں

ترے کہنے کا ہے مجھے یقیں میں ترے ڈرانے سے ڈر گیا

کروں ذکر کیا میں شباب کا سنے کون قصہ یہ خواب کا

یہ وہ رات تھی کہ گزر گئی یہ وہ نشہ تھا کہ اتر گیا

دلِ ناتوان کو تکان ہو مجھے اس کی تاب نہ تھی ذرا

غمِ انتظار سے بچ گیا تھا نویدِ وصل سے مر گیا

مرے صبر و تاب کے سامنے نہ ہجومِ خوف و رجا رہا

وہ چمک کے برق بھی رہ گئی وہ گرج کے ابر گزر گیا

مجھے ہجرِ غم سے عبور کی نہیں فکر اے مرے چارہ گر

نہیں کوئی چارہ کار اب مرے سر سے آب گزر گیا

مجھے رازِ عشق کے ضبط میں جو مزا ملا ہے نہ پوچھئے

مئے دو آتشہ کا یہ گھونٹ تھا کہ گلے سے میرے اتر گیا

نہیں اب جہاں میں دوستی کبھی راستہ میں جو مل گئے
نہیں مطلب ایک کو ایک سے یہ ادھر چلا وہ ادھر گیا
اگر آکے غصہ نہیں رہا تو لگی تھی آگ کہ بجھ گئی
جو حسد کا جوش فرو ہوا تو یہ زہر چڑھ کے اتر گیا
تجھے نظمؔ وادی شوق میں عبث احتیاط ہے اسقدر
کہیں گرتے گرتے سنبھل گیا کہیں چلتے چلتے ٹھہر گیا

۳ فعلات فاعلاتن دوبار ۱۱

کہیں قابل سماعت مرا حال زار ہوتا
کہ فسانہ خوب تھا یہ اگر اختصار ہوتا
غم عشق تھا تو پھر کیوں غم روزگار ہوتا
نہ یہ جن کبھی اترتا نہ جنوں سوار ہوتا
نہیں خود کو دیکھ سکتا کہ جہاں میں خود ہے یکتا
کبھی اپنے عکس سے بھی وہ نہیں دوچار ہوتا
نہیں تاب ضبط غم کی مرے مشت استخواں میں
بھڑک اٹھتا خس میں پنہاں جو ذرا شرار ہوتا
در دوست کی طلب میں مجھے کیا برا تھا مرنا
جو قدم قدم پہ ہوتا جو ہزار بار ہوتا

مجھے اس خیال پر بس ہے امید عفو اس سے
کہ وہ چاہتا تو ہرگز نہ میں بادہ خوار ہوتا

نہیں اعتنا کے لائق یہ وجود بے حقیقت
کہ اگر لباس ہوتا تو یہ مستعار ہوتا

میں سمجھتا مستحق ہوں میں سزا کا یا جزا کا
مری ہست و بود کا بھی تو کچھ اعتبار ہوتا

اگر اپنے سوز غم کو نہ دبا دبا کے رکھتا
تو چٹک کے اخگر اخگر ابھی اک شرارہ ہوتا

وہ مآل زندگانی جسے کہتے ہیں غم عشق
یہ اگر پہاڑ ہوتا تو نہ دل پہ بار ہوتا

دل نالہ کش میں قاتل قدر افگنی کا تیری
کوئی تیر ایسا ہوتا کہ فلک کے پار ہوتا

۷۳ —— مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات —— ۹

جہاں میں کوئی نہ کوئی عدوئے جاں ہوگا
ہوا چمن میں نہ گلچیں تو باغباں ہوگا

جدھر سے قافلہ گزرے گا خاکساروں کا
سپہر ناز کشش گرد کارواں ہوگا

لگا کے تیر مجھے روئے گا لہو ظالم
کہ موج خوں اسے خمیازۂ کماں ہوگا

یہ آکے دیکھ کرامات میکدہ اے شیخ
کہ ایک جام میں تو پیر سے جواں ہوگا

گلا جو کاٹ کے مر جائے تو یہ ڈر ہے
کہ سب کا اس ستم ایجاد پر گماں ہوگا

نگاہ اس نے جو پھیری تو مر مٹا دل زار
خبر نہ تھی کہ یہ ایسا مزاج داں ہوگا

لگا کے تیغ بگڑئیے نہ سمجھئے انصاف
تڑپ سکے گا وہ کیوں کر جو ناتواں ہوگا

غضب کیا جو کسی کے خرام کو دیکھا
نہ جانتا تھا کہ دل یوں رواں دواں ہوگا

خدا کو ڈھونڈنے جانا ہے کیا کہیں اے نظم
ہر ایک جادہ ملیگا جو بے نشاں ہوگا

۳۴ —— ۱۶

کہا جو تو نے دل ناصبور میں نے کیا
بتا کہ تو نے کیا یا قصور میں نے کیا

بغل سے دل کو نکالا کچل کے پھینک دیا
یہ ایک مفت کا جھگڑا تھا دور میں نے کیا

یہ تم کہو کہ نہ آنا یہاں نہ آوں میں
ضرور تم نے کہا اور ضرور میں نے کیا

تمہارا ذکر ہے کیا تم کو کون کہتا ہے
فساد میں نے اٹھائے فتور میں نے کیا

کہا تھا کس نے کہ موسیٰ سے تو لڑا آنکھیں
اشارہ تجھ سے تمہارے برق طور میں نے کیا

جہاں کہیں ہوئی کثرت رہا میں آپ سے دور
جہاں ملی مجھے خلوت ظہور میں نے کیا

رہوں میں ستر گریباں یہ امر تھا دشوار
یہ سہل تھا کہ گریباں کو دور میں نے کیا

پھرا نہ سوچ حوادث نے لاکھ منہ پھیرا
چڑھاؤ کاٹ کے آخر عبور میں نے کیا

لگا نہ خاک سے دامن نہ خاک دامن سے
صبا کی طرح جہاں سے مرور میں نے کیا

اٹھے نہ اپنے پاؤں سے پیری میں سر نہیں اٹھتا
سزا یہ اس کی ہے جیسا غرور میں نے کیا

وہ حشر میں بھی لیں مجھسے یہ نہیں امید — خفا ہیں اس لئے کیوں ترک جور میں نے کیا

یہ اڑ کے تخت سلیماں کی خاک کہتی ہے — بسر اب سر بال طیور میں نے کیا

وہ میرے نالہ سوزاں کو کیا سمجھتے ہیں — قیامت آئی اگر نفخ صور میں نے کیا

خدا نے منہ میں زباں دی زباں میں لطف سخن — اس ایک بات پہ کتنا غرور میں نے کیا

نگاہ شوق نے میری سکھا دی آرائش — مژہ کو شانہ کش زلف حور میں نے کیا

جو مجھ سے رکھتے ہیں اے نظم حسن ظن احباب

تو میں سمجھتا ہوں کچھ کروزور میں نے کیا

٣٩ —— ١٦

ہزار آنکھ پڑی جب فراز بام آیا — ہمائے حسن پری زاد زیر دام آیا

یہ کیوں کہا تھا کہ میرا مہ تمام آیا — گیا سحر سے وہ ظالم تو وقت شام آیا

ہمارے حصے میں جھوٹا جو اسکا جام آیا — لب نگار سے بوسے کا یہ پیام آیا

ہے سب کو خانہ خرابی یہ شبہ تعمیر — ہوا غبار جو اونچا تو بن کے بام آیا

جو بھول کر بھی خوشی کا گزر ہوا دلمیں — خیال موت کا لینے کو انتقام آیا

دیار عشق میں وہ صاحب نگیں ہو نہیں — کہ یار کے لب لعلیں پہ میرا نام آیا

ترانہ سنج ہوا اے عندلیب تیرے لئے — ہر ایک گل بھی گلگوں کا لیکے جام آیا

کلیجہ پک گیا ناحق کو منہ لگانے سے — یہ پیچھے بیٹھے مجھے کیا خیال خام آیا

عذاب جاں مجھے ہو جاتی شام تنہائی — بھلے کو ساتھ بلاؤں کا اژدحام آیا

بڑا یہ حق محبت ادا کیا اس نے
کوئی جو ساتھ جنازے کے چند گام آیا

زبانکا دانتوں نے پیری میں ساتھ چھوڑ دیا
کوئی رفیق بُرے وقت میں نہ کام آیا

گیا ہے لینے کو اسکے مگر یقیں ہے مجھے
پیام بر کے لئے موت کا پیام آیا

گماں رقیب کا ناصح پہ ہے بجا مجھ کو
کلیجہ تھام لیا جب کسی کا نام آیا

کھلے جو بند قبا شب کو اسکے میں سمجھا
کہ صبح حشر ہوئی وقت انتقام آیا

نگاہ ہو کے پریشاں پھری ہے کاکل سے
عجیب ہے کہ یہ رشتہ تھا ان کے دام آیا

خدا کا خوف کرو ظلم ہوش میں آؤ
کرو شراب سے توبہ مہ صیام آیا

۴۰ ——— ۱۶

بشہوت و غضب آلودہ دل ما را
بہ کعبہ طرح بنا ریختی کلیسا را

ز خویش رفتہ گرفتیم راہ صحرا را
سلام ما کہ رساند دیار سلمیٰ را

اگرچہ رخصت دیدار دادہ ما را
نگاہ قہر تو خوں می کند تماشا را

ہوائے ابر بیفزود جوش صہبا را
شکست توبہ صدا کرد جام و مینا را

بہ بزم جلوہ برگرفتیم و ہمچو آئینہ
فروختیم بہ یک عشوہ دین و دنیا را

گذشت عمر و ندیدم کہ آسماں بکشود
بہ ناخن مہ نو عقدۂ ثریا را

قلیل فرصت عمر و کثیر حاصل عمر
حباب چشم کشود و بدید دریا را

غبار بام ربودست و گرد باد ستوں
عجب کہ خانہ برانداختند صحرا را

عبور بحر معانی و دستیاری کلک — شگافتم به عصا چون کلیم دریا را
حذر ز آه فلک تا ز تو دلِ بیمار — که شکل دار بیاد آورد مسیحا را
هزار معنی مثبت ز نفی می خیزد — که نیستی پر پرواز داد عنقا را
به جستجوی توام مشل دانه تسبیح — سپرده ام بسر این راهِ گام فرسا را
دلم گداخت چو مینا ز هولِ گرمی حشر — به بی حرارت اندیشهای فردا را
ستاده ام به ره شوق همچو نرگس زار — که آوریم بکف دامن مسیحا را
سراغ میکدهٔ دل گرفته ام از شاد — خبر کنید حریفان باده پیما را

مخور فریب نظر تشنه لب بمیرای نظم
سراب آئینه دار است حال دنیا را

۴۱ —————— ۱۰

[..]ن ز نگاه تو با کیف می چه کار مرا — [..]ن و بهار تو با فصل دی چه کار مرا
بغیر صور به سرافیل محشر است اینجا — فغان چو خیزد هم از دل به نی چه کار مرا
[..]ن ز تماگری لذتِ جفای حبیب — به شکوهٔ ستم پی به پی چه کار مرا
فریب عشوهٔ دنیا نخورده ام مخموم — بناز و غمزهٔ بیجاش هی چه کار مرا
ز بیخودی به گذشتم ز لامکان و مکان — به فکر هستی لاشی و شی چه کار مرا
بلند شد علم مهر و شبنم از جا شد — که با مسابقت ظل و فی چه کار مرا
[..]ن چو دوست شدی بس ضمان من برنت — چنین مگو که به کردار وی چه کار مرا

جزائے ترک وفا ایں سعدی نشست | ولے نہ گفت کہ با ملک رے چہ کارمرا
ق
بظل معدلت خسرو وکن اے نظم | بعدل وسطوت کسریٰ وکے چہ کارمرا
وظیفہ ام رسد از خوان نعمت عثماں خلد اللہ ملکہ
بوصف حاتم طائی وطے چہ کارمرا

۴۴ — مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات — ۱۲

دل راز عشق کا متحمل نہیں ملا | سر سجدۂ نیاز کے قابل نہیں ملا
دریائے عشق پہ کے دو ہاتھ رہ گیا | موج ضعیف تھا مجھے ساحل نہیں ملا
کیا جانے لطف عشق بجز بحث بے مزہ | ناصح تجھے دماغ ملا دل نہیں ملا
محروم ہم ہیں عید سے بھی اوجفا شعار | اب بھی گلے سے خنجر قاتل نہیں ملا
جادہ ملا تمہارا رشتہ تسبیح کی طرح | آرام مجھ کو سیکڑوں منزل نہیں ملا
گردش سے ہم بھنور میں رہے جس طرح ہلال | کشتی اگر ملی بھی تو ساحل نہیں ملا
کہتے پہ سب کے جبر گوارا کیا تو کیا | کس کام کا ملاپ اگر دل نہیں ملا
ابرو کا اس کے دوسرا ابرو جواب ہے | ایسا کسی کو مد مقابل نہیں ملا
انساں کا دل تھا بار امانت کے واسطے | اس درد کا کوئی متحمل نہیں ملا
ہو کر نفس شکستہ کرے عرض شوق کیا | اچھا ہوا کہ قیس کو محمل نہیں ملا
اک برق تھی کہ آگ لگائی نکل گئی | بسمل پھڑک کے رہ گئے قاتل نہیں ملا

ہے ظلم نیمچاں پہ چھری تیز رات دن
قاتل کو دوسرا کوئی بسمل نہیں ملا

۳۴ — ۱۶

یاد میں تیری جلوہ دلکش بہار کا
تھا یہ بھی شعبدہ کوئی لیل و نہار کا

پشتارہ لے چلا ہوں غم روزگار کا
گنبد ذرا بلند ہو میرے مزار کا

اونچا ہوا غبار جو اس خاکسار کا
پہنچا فلک کو گو نہیں صدمہ فشار کا

لو بوالہوس اور اہل جنوں کا مقابلہ
کیا توڑ ملے ہے اہل گریباں کے تار کا

ٹپکیگا خون برق کی لہروں سے باغ میں
ہے جوش میں لہو رگ ابر بہار کا

ہم تو کچھ اس طرح سے گرے پھر نہ اٹھ سکے
کیا پوچھنا غبار سر رہ گزار کا

حاصل نہیں ہے زیست کا جز رقص بیخودی
لو میں سمجھ گیا یہ اشارہ شرار کا

ہے لوٹنا پسند مجھے شاخ بید کا
ہے جھومنا پسند مجھے لالہ زار کا

دیوار پھاندنے کو ہے نشو و نمائے تاک
دامن پکڑ لیا ہے نسیم بہار کا

ہستی کا قافلہ ہے عدم کی طرف رواں
دور سپہر ایک تتق ہے غبار کا

مانو تو کچھ ہے اور نہ مانو تو کچھ نہیں
بازار دہر میں ہے چلن اعتبار کا

ہر دم ہے وہم شماری پیہم سے دل کو کد
کھٹکا لگا ہوا ہے یہ روز شمار کا

نادان اپنے نفس پہ کرتا ہے آپ ظلم
شکوہ زباں پہ ہے ستم روزگار کا

اس زلف مشکبو کی سیاہی نہیں ملے
کالا کروں گا منہ میں شب انتظار کا

سجدہ کیلئے جب سے ترے آستاں پر — ہے عرش پر دماغ ترے خاکسار کا
شاہوں کو ناز تخت مرصع پہ ہے تو ہو — مالک ہوں میں بھی کلک جواہر نگار کا

۴۴ — ۲۳

سینہ میں دل ہو دل میں کچھ ارماں نہو تو کیا — آنکھوں میں اشک اشک میں طوفاں نہو تو کیا
سہری یہاں نہیں ہے جو ساماں نہو تو کیا — داماں نہو تو کیا جو گریباں نہو تو کیا
دو دن کے واسطے سر و ساماں نہو تو کیا — سب کچھ تہی جو دل ہی میں ارماں نہو تو کیا
ہیکل پہ ہاتھ رکھ کے قسم کھا گئے ہیں وہ — بدعہد کے گلے میں جو قرآں نہو تو کیا
کیا اے فلک ملا ہمیں بازار دہر سے — ظالم متاع درد بھی ارزاں نہو تو کیا
لایا ہے کوئی ساتھ نہ لیجائے گا کوئی — دولت ہو اور عادتِ احساں نہو تو کیا
ہے قد سے قد ملا کے بہت سرو کو غرور — اس طرح ناز سے جو خراماں نہو تو کیا
تالو سے جب زباں نہیں لگتی جناب کی — ناصح بھلا دماغ پریشاں نہو تو کیا
راضی ہوں فصد خون نہ دے بیچ کیجئے — تسکینِ دل جو ہلیگی دوراں نہو تو کیا
سالک کو حق کے ڈھونڈنے ہی میں ہے کچھ مزا — اس راستے میں بھول بھلیاں[1] نہو تو کیا
دن میری زندگی کے گزر جائیں صبح تک — اتنا بھی طول اے شبِ ہجراں نہو تو کیا
رکھا نہ معصیت نے کہیں کا مزا حیف — بندہ ہو اور تابع فرماں نہو تو کیا
مانا کہ تو نے غیر کیا نظم اپنا حال — معلوم اس کو حال پریشاں نہو تو کیا

[1] بھول بھلیاں محاورہ میں مفرد مونث ہے ۱۲

مانا کہ تو نے جوگ لیا دردِ عشق میں / اس حال پر بھی گر کوئی پرساں نہو تو کیا
یہ تو بتا کہ چاک گریباں سے فائدہ / جب تیرا ہاتھ اور اس کا گریباں نہو تو کیا
مانا کہ تیرے اشک میں گوہر کی ہی چمک / عارض پہ اسکے وصل کے غلطاں نہو تو کیا
اچھا یہی سہی کہ وہ محشر خرام ہے / تلووں کے نیچے دیدۂ حیراں نہو تو کیا
یوں خاک و خوں میں لوٹ گئے تم تو کیا حصول / قاتل کا اپنے ہاتھ میں داماں نہو تو کیا
جھک جھک کے ڈھونڈتا ہی عبث اس گلی میں تو / اس خاک میں ترا دلِ نالاں نہو تو کیا
جاتا ہے اسکے در پہ تو اتنا سمجھ تو لے / گر تیرے روشناسوں میں درباں نہو تو کیا
گر اذن عام غیر کو ہے تو ہوا کرے / تیرا گذر وہاں کسی عنواں نہو تو کیا
کہتے ہو جو پڑے گی مصیبت اٹھائینگے / لیکن وہ ظلم کرکے پشیماں نہو تو کیا
سوچے ہو جان دینگے جو دشوار ہوگا وصل / مرنا بھی ہیر ہجران جو آساں نہو تو کیا

۵۵ ۱۱

بندہ کسی طرح نہ سزائے جحیم تھا / یا رب میں روسیاہ سہی تو کریم تھا
کوٹھے پہ آکے نعش کا جانا تو دیکھ لے / لے اٹھ گیا جو تیری گلی میں مقیم تھا
واعظ خدا کے واسطے اس ابر کو تو دیکھ / پیتے اگر نہ مے تو گناہِ عظیم تھا
کیا کرتے ہم کہ ضبط سے گھبرا گیا تھا جی / کھینچی اک ایسی آہ کہ بس دل دو نیم تھا
نازک ہے انتہا کا دماغِ فروتنی / ہمکو تو سر اٹھانا ہی بارِ عظیم تھا
دنیا کے نعمتوں میں برابر کا زہر ہے / اصلاح تو یہ دیکھئے آخر حکیم تھا

ایک ہم تھے اور پرسش اعمال قبر میں
آخر کوئی رفیق نہ کوئی ندیم تھا

دنیا سے دل اٹھا کے عجب سیر دیکھ لی
اک دوش پر جنازہ کہ امید و بیم تھا

ساتوں فلک نہ بار امانت اٹھا سکے
ہم نے اٹھا لیا وہ جو بار عظیم تھا

اے آسمان میری تباہی روا نہ تھی
تھا خاک بھی تو خاک رہ مستقیم تھا

اے نظم خوب راہ نمائی جنوں نے کی
گلشن سے دشت ایک خط مستقیم تھا

۴۶ ——— ۱۵

ہیں پاکے اس سے عفو کا پروانہ چھٹ گیا
اہل خرد دھرے گئے دیوانہ چھٹ گیا

کیا حال پر ملال شب غم بیاں کروں
ظلمت وہ تھی کہ شمع سے پروانہ چھٹ گیا

آئی تھی اب مزہ پہ کہانی شباب کی
کس لطف کے مقام سے افسانہ چھٹ گیا

کس راستہ سے ناقہ لیلیٰ کو لے چلا
اے ساربان قیس کا ویرانہ چھٹ گیا

مستی میں ایک کی نہ رہی ایک کو خبر
شیشے سے بزم عیش میں پیمانہ چھٹ گیا

کاجل لگا کے لاش پہ رونے کو آئے تھے
اشکوں سے رنگ نرگس ستانہ چھٹ گیا

تو اضطراب شوق بھی نکلا حریف ہم
چٹکی میں آکے شمع کی پروانہ چھٹ گیا

قابو سے نفس بد کو نکلنے نہ دے کبھی
پھر شیر ہے جو یہ سگ دیوانہ چھٹ گیا

دیکھا فریب حسرت بزم وصال کا
دست مژہ سے سبحہ صد دانہ چھٹ گیا

دی آکے کیا نسیم نے حسرت فزا خبر
ہر شاخ گل کے ہاتھ سے پیمانہ چھٹ گیا

تھا وصل روح و تن نفس واپسیں تلک
دم بھر میں ایک عمر کا یارانہ چھٹ گیا

احسان یہ کیا عرق انفعال نے
دامن سے داغ گریہ مستانہ چھٹ گیا

واعظ بتا مجھے کہ یہ کس کی نظر لگی
ہونٹوں تلک آکے ہاتھ سے پیمانہ چھٹ گیا

زاہد جو شہر چھوڑ کے صحرا نشیں ہوا
اس کو یہی قلق ہے کہ میخانہ چھٹ گیا

رکھا ہے کیا وطن میں اب اے نظم خستہ جاں
ہو اسلیے اُداس کہ ویرانہ چھٹ گیا

٤٧ ——— مفعول فاعلاتن دو بار ——— ٤١

پرسش جو ہوگی تجھ سے جلاد کیا کرے گا
لے خون میں نے بخشا تو یاد کیا کرے گا

ہوں دام میں پریشاں اور سادگی سے حیراں
کیوں تیز کی ہیں چھریاں صیاد کیا کرے گا

ظالم یہ سوچ کر اب دیتا ہے بوسۂ لب
جب ہونٹ سی دئے پھر فریاد کیا کرے گا

زنجیر تار داماں ہے طوق اک گریباں
زور جنوں نہ کم ہو حداد کیا کرے گا

ہم ڈوب کر مریں گے حسرت رہیگی تجھ کو
جب خاک ہی نہ ہوگی برباد کیا کرے گا

یعقوبؑ قطع کردیں امید وصل دل سے
یوسف سا بندہ کوئی آزاد کیا کرے گا

دل لے کے پوچھتا ہے تو کس کا شیفتہ ہے
بھولا ابھی سے ظالم پھر یاد کیا کرے گا

اے خط بیاض عارض درکار ہے جو تجھ کو
تحریر حسن کی کچھ روداد کیا کرے گا

کنج قفس سے اک دن ہو گی رہائی اپنی
مر جائیں گے تو آخر صیاد کیا کرے گا

مثل سپند دل ہے بیتاب سوز غم میں
رہ جائے گا تڑپ کر فریاد کیا کرے گا

اے شیخ بھر گیا ہے کیوں وعظ کی ہوا میں
ریش سفید اپنی برباد کیا کرے گا

ظلم و ستم سے بھی اب ظالم نے ہاتھ کھینچے
اس سے ستم وہ بڑھ کر ایجاد کیا کرے گا

از بسکہ بے ہنر ہوں میں ننگ معترض ہوں
مضموں پہ میرے کوئی ایراد کیا کرے گا

اے نظم جس کو چاہے وہ دے بہشت دوزخ

نمرود کیا کرے گا شداد کیا کرے گا

۴۸ —— فاعیل مفاعیل مفاعیل فعولن —— ۲۰

واعظ نے در کعبۂ عرفاں نہیں دیکھا
عارف نے صنم خانۂ امکاں نہیں دیکھا

جی بھر کے کبھی جلوۂ جاناں نہیں دیکھا
تم نے اسے اے موسیٔ عمراں نہیں دیکھا

گلشن نہیں دیکھا کہ بیاباں نہیں دیکھا
جمعیت دل کا کہیں ساماں نہیں دیکھا

یہ آئینہ خانہ ہے طلسمات خودی کا
ویراں سے دیکھا کبھی تو ویراں نہیں دیکھا

دل نالب خاموش نہیں نالہ کی گذرگاہ
گردوں کو حریف خم چوگاں نہیں دیکھا

پھر رک نہ سکیں گی یہ جوانی کی امنگیں
روکو ابھی توسن نے بیاباں نہیں دیکھا

زاہد کی کمیں گاہ سے واقف ہے بھلا کون
کیا جانے وہ جس گرگ نے باراں نہیں دیکھا

کیا جانے پریشانی خاطر وہ کسی کی
اس نے تو کبھی خواب پریشاں نہیں دیکھا

پہنچا ہی دی منزل پہ ملی جس کو رہ راست
اس کو کبھی افتاں کبھی خیزاں نہیں دیکھا

آساں جسے سمجھے اسے آساں ہی پایا
مشکل جسے سمجھے اسے آساں نہیں دیکھا

دم لے کے ذرا راہ میں جب تک ہیں اچھل
کوسوں تجھے اے عمر گریزاں نہیں دیکھا

رہ رہ کے اڑی خاک سلاطین سلف کی
گردوں سے کبھی دست و گریباں نہیں دیکھا

جس تیر نے پلہ نہ کیا ہے وہ پر کاہ
بیکار ہے جس تیغ نے میداں نہیں دیکھا

وا ہی حقیقت میں بھرا جامی جانے
ایسا بھی جنوں خیز بیاباں نہیں دیکھا

ہے تنگ کدۂ دہر میں حیرت کی تجلی
نرگس نے کبھی سایۂ مژگاں نہیں دیکھا

مستوں کے لئے رشک کی جا ہے سفر برق
جز ابر سیہ اور شبستاں نہیں دیکھا

کیا حال گلستاں کا کہے کوئی سنے خاک
طاؤس کو اس طرح پرافشاں نہیں دیکھا

ہے سایہ فگن فرق پہ گرد قدم اپنی
بکھرے تھے یوں چتر سلیماں نہیں دیکھا

وحشت میں بھی پابند رہا وضع کا اپنی
کوچہ کوئی جز چاک گریباں نہیں دیکھا

کیا پوچھنا اے نظم اس آزادہ روی کا
یوں سرو کو بھی بر زدہ داماں نہیں دیکھا

۲۱

سب دل کا بخار آنسوؤں کے تار نے کھینچا
آندھی کو رگ ابر گہر بار نے کھینچا

ہر اشک کے سیلاب میں جھنکار کی آواز
پرکالہ دل گریہ سرشار نے کھینچا

نقشہ نہ کھنچا خواب پریدہ کا کسی سے
کھینچا تو مرے دیدہ بیدار نے کھینچا

ایسی ہی ترے ہاتھ کے بوسے کی تمنا
اس شوق میں چلہ لب سوفار نے کھینچا

شق القمر انگلی کے اشارہ سے دکھایا
نقشہ جو ترے آئنہ رخسار نے کھینچا

کن کن ثمروں کو قد موزوں نے سنبھالا
کس بوجھ کو سوئے کمر یار نے کھینچا

بگڑے کبھی جنگی ہی سے گیسوئے عنبر
نالہ کبھی پازیب کی جھنکار نے کھینچا

چھپ چھپ کے کبھی رو دیا تو گنہگار ہوا میں
محشر میں گریباں ستم دلدار نے کھینچا

سینے اور اپنے داغ ہی افشاں کا ستارہ
کاکل سے رہائی ہوئی رخسار نے کھینچا

مجنوں کو مری وحشت او دی پہ حسد ہے
کانٹا جو چبھا پاؤں میں خو دیار نے کھینچا

جب آہ کی آثار سحر کے نظر آئے / سورج کی بلاؤں کو دل زار نے کھینچا

چھالوں نے مری پاؤں کی آنکھوں سے لگایا / دامن کو مرے دشت میں ہر خار نے کھینچا

پھر تم مجھے کہنا نہ کبھی مرشد ... ور / تھرو نہ اٹھا تیغ کا اگر وار نے کھینچا

چھوڑ نہ سگانے کا جو ابرو کو میرا شوق / آہو سے حرم طرۂ طرار نے کھینچا

لی ابر بہاری نے پر زاغ کی رنگت / نقشہ دم طاؤس کا گلزار نے کھینچا

گریہ کا تعلق مری پلکوں سے عجب ہے / سیلاب کا دامن نہ کبھی خار نے کھینچا

خورشید سحر گاہ کا جب تک نہ کیا خون / نقشہ نہ کبھی تو ہندوی شب تار نے کھینچا

لہرانے لگا دل جگر نوک مژہ پر / گلزار کو خنجر سر دیوار نے کھینچا

تو راہ زن ہستی تھا وا ... پا / اچھا ہوا سولی پہ تجھے دار نے کھینچا

دو دم گلزار ہا شب کو یہاں کس / آغوش میں ... تیغ ہشیار نے کھینچا

سولی نظر آئے گی مسیحا کو فلک پر / نالہ جو کبھی دل تیرے بیمار نے کھینچا

یاد سخن غیر کو فریاد نہ کرنا / سمجھا گئے ایسا کہیں ارشاد نہ کرنا

صد ہوں گا گلا اے دل ناشاد نہ کرنا / جلاد کو چاہا ہے تو فریاد نہ کرنا

گیسوے رسا تم دل ناشاد نہ کرنا / اب دام میں لائے ہو تو آزاد نہ کرنا

یہ تو نہیں کہتا میں کہ بیداد نہ کرنا / ہاں اپنی طرف سے کوئی ایجاد نہ کرنا

بھولا نہیں گزشت کا زمانہ مجھے اب تک / وہ میرا تڑپنا وہ ترا یاد نہ کرنا

[illegible] تو گئے سرِ دفن
اور میں یہ کہوں خاک کو برباد نہ کرنا

پھٹکی ... کوئل کی کوکو کی صورت
نالہ ابھی اے مرغِ چمن زار نہ کرنا

ہم سے وہ اس انداز سے کرتے ہیں ملاقات
ہم ظلم کریں تم پہ تو فریاد نہ کرنا

تا دیر سمجھ میں نہ آتا ہے مجھ کو
تو قتل میں جلدی کہیں جلاد نہ کرنا

کچھ بھی نہ چلا جادو ... بیان سلف کا
دیکھو مرے اشعار پہ ایراد نہ کرنا

بندہ تو ہوا اس ... تیرے ہاتھ
لیتا ہے اگر مول تو آزاد نہ کرنا

اور وعدہ خلافی سے تغافل کی قسم ہے
تا عمر مجھے بھول کے بھی یاد نہ کرنا

اے نظم عجب لطف ہے دیوانہ بنی میں
ہاں ترک کبھی عشق پری زاد نہ کرنا

فعلاتن مفاعلن فعلات ١٦

کبھی تیوری چڑھا کے دیکھ لیا
اور کبھی مسکرا کے دیکھ لیا

آئینہ کی آزما کے دیکھ لیا
تم نے چھریاں لگا کے دیکھ لیا

دل کو تلووں سے مل کے وہ بولے
پھول کو تلملا کے دیکھ لیا

دیکھ سکتے تھے آنکھ سے نہ جسے
اس کو دل میں چھپا کے دیکھ لیا

پھول سے ہیں سبک قدم اس کے
میں نے آنکھیں بچھا کے دیکھ لیا

حال اس شوخ نے مرے دل کا
کیا نظر میں سما کے دیکھ لیا

کچھ پر احسان ہوا نزاکت کا
تو نے گر آنکھ اٹھا کے دیکھ لیا

دیکھنا ہی نہ تھا او عدو دل زار
تیرے کہنے میں آ کے دیکھ لیا

دھجیاں آستیں کی کہتی ہیں
ہاتھ پیچا تڑا کے دیکھ لیا

ٹھگیا میں سمجھ کے پیچ اس کو
کیوں بہانہ بنا کے دیکھ لیا

ایک ہی ہاتھ کا تھا سارا جہاں
ہاتھ ہم نے اٹھا کے دیکھ لیا

کچھ نہ سمجھا کہ اس نے جاتے وقت
ہائے کیوں منہ پھرا کے دیکھ لیا

کچھ کرو اپنی ہی سی کرتا ہے
دل کے ٹکڑے اڑا کے دیکھ لیا

نزع میں بھی ملا جو نامۂ یار
اُٹھ کے بیٹھا اٹھا کے دیکھ لیا

دل کی چوری بھی کھل گئی سب پر
آنکھ تم نے چرا کے دیکھ لیا

نہ ہوا داغ کا جواب اے نظم
طبع کو آزما کے دیکھ لیا

۵۲ ——— شاعرہ سروجنی نائڈو ——— ۶

کام آخر نہ ہونا تھا نہ ہوا
فکر کا ہیکی اب - ہوا نہ ہوا

خاک پا ہو کے نقش پا نہ ہوا
تیرے قدموں سے میں جدا نہ ہوا

دل تو دیتا ہے تجھے یارب
اور اگر درد آشنا نہ ہوا

حسن اس کا نہ آنکھ دیکھ سکی
سات پردے تھے سامنا نہ ہوا

ہم کو کہنا تھا جو وہ کہہ گزرے
دل میں قائل ہوا وہ یا نہ ہوا

لے زمین انہی مرحوم کی نکالی ہوئی ہے ۱۲

اڑ رہا ہوں غبار ہو ہو کر | زور پروازِ جستجو نہ گیا
نظمؔ اس سال بھی زیارت کو
جانے والے تھے لوگ تو نہ گیا

۴۴

خیال و خواب سا گذرا نظر شکل سراب آیا
یہی جلدی تھی جانے کی تو کیوں عہد شباب آیا
کہاں لے نظمؔ لے کر کاروانِ صبر و تاب آیا
جہاں اسوار طوفاں موجِ خیز اضطراب آیا
شبِ غم میں ستاروں کے لئے روزِ حساب آیا
مری اختر شماری کو سمجھتے ہیں عذاب آیا
سحاب تیرہ لے کر خیمۂ مشکیں طناب آیا
اور اس ظلمات میں ساقی نہ لے کر آفتاب آیا
عبث کی گردشِ افلاک نے گہوارہ جنبانی
نہ دل ٹھہرا نہ غم بھولا نہ موت آئی نہ خواب آیا
نکل اے جانِ مضطر میں بھی اب ہوں ہمعنان تیرا
ٹھہر اے عمرِ رفتہ میں بھی تیرے ہم رکاب آیا
فلک اندر فلک ہے کائنات اس بزمِ عالم کی

عشرت کا پیمانہ حباب اندر حباب آیا

جواہر ریز ہے گردوں طرب انگیز ہے ہاموں
شفق سے شیشۂ شبنم میں یاقوت مذاب آیا

قدم سے طاقت رفتار کچھ کہتی ہے رہ رہکر
میں اب جھجھک کے چلتا ہوں کہ سن کو کیا جواب آیا

شب غم ہجر نہ پوچھو دم نکلنے میں ہے کیا لذت
اجل اس طرح سے آئی کہ میں سمجھا کہ خواب آیا

نہ ہے قسمت نہ خنجر کیا جی بھر کے نظارہ
نہ بسمل کی پلک جھپکی نہ قاتل کو حجاب آیا

نہ جا میخانہ میں اے نظم ہم تجھ سے کہتے تھے
وہاں سے ہو کے کم ہوش و سیہ مست و خراب آیا

حرف (ب)

۵۵

اٹھا ہوں مثل گرد قدم کی صدا سے کب
آشنا ہی احتیاج کا داغ التجا سے کب
منتیں کو جھیل جاؤ تو سعادت شکار ہے
ہرگز گھٹا نہ عشق رہ مستقیم کا

۱۵

پاؤں لگا قافلہ کا نشہ نقش پا سے کب
او ہنرہ کار آگ بجھی ہے ہوا سے کب
خالی ہے اس پہاڑ کی چوٹی ہما سے کب
سر کا یہ آفتاب خط استوا سے کب

کب ہوگا برطرف غم و اندوہ اے کریم
پانی سفید ہوگا کالی گھٹا سے کب

فریاد کس سے کیجئے گردوں کی دوری میں
نکلی پسے ہوؤں کی صدا آسیا سے کب

تو بھی تو ہمرکاب تھا اے شوق کوئے یار
پیچھے میں رہ گیا ہوں صدائے درا سے کب

ہوتی ہے کم بڑھ کے ہوس کیا حرص میں فروغ
تھمتی ہے موج آب گہر میں ہوا سے کب

ہے اس طرف ہر ایک رگ جاں کھنچی ہوئی
بے ربط کاہ کو ہے بھلا کہربا سے کب

پہنچی ہے ٹھیک وقت پہ چھائی تنک گھٹا
کیا جانے چلی تھی یہ کوہ صفا سے کب

دو نسخ ہی میں گر اسے لکھا کیے نقش شوق
یہ پوچھتا ہے راہ کسی رہنما سے کب

کیا جانے کب طلسم خودی سے نجات ہو
نکلے یہ عکس آئینۂ ماسوا سے کب

ہم کو تمھارے نام کی چھیڑوں سے تنگ ہو
دھویا تھا ہاتھ خضر نے آب بقا سے کب

جب دل کو ظلم سہنے میں آنے لگا مزہ
توبہ وہ کرنے بیٹھے ہیں جور و جفا سے کب

نکلے گا دل سے نظم کے کیونکر غم حسین
جاتا ہے رنگ لعل سے سرخی حنا سے کب

۶۵ — ولہ — ۹

کھوئے ہوئے ہیں یا نشے ہم رند بے پروا ہیں آپ
ساقیا اپنی بغل میں شیشۂ صہبا ہیں آپ

غافل ہشیار رو و تمثال یک آئینہ ہیں
ورطۂ حیرت میں ناداں آپ ہیں دانا ہیں آپ

کیوں ہے میری وحشت کش بال ملک
نالۂ مستانہ میرے آسماں پیما ہیں آپ

تجھ سے ہے خضر کو اور آب حیواں کی طلب
اور پھر عزلت گزین دامن صحرا ہیں آپ

منزل طول امل پیش اور رحلت سے کم
راہ کس سے پوچھئے حیرت میں نقش پا ہیں آپ

حق سے طالب وصل کے ہوں ہم سا پھر اپنے ہیں کیا
ہم کو جو کوتہ نظر سمجھیں وہ نابینا ہیں آپ

گل ہمہ تن زخم ہیں پھر بھی ہمہ تن گوش ہیں
بے اثر کچھ نالہائے بلبل شیدا ہیں آپ

حسن سے شکوہ کروں کیا ہاتھ پھیلاتے ہیں
کہتی ہے وہ اپنے ہاتھوں خلق میں رسوا ہیں آپ

ہم سے اے اہل ستم منہ چھپانا چاہیے
دم بخود کرتے ہیں ہم اور آئینہ سیما ہیں آپ

حرف (ت)

۱؎ دم سے آئینہ مکدر ہو جاتا ہے ۱۲

اک مشت استخواں پہ گناہوں کا بوجھ ہائے
تھا اس نحیف و زار کو بار کفن بہت

نقشہ چمن میں غفلت اہل جہاں کا ہے
اترا رہے ہیں یہ جو پھول ہیں گلگفن بہت

ہم کو بھی مل رہیگی کسی سے سخن کی داد
جوہر شناس سیکڑوں ہیں اہل فن بہت

٥٩ ولہ ٣٧

پرتو حسن تو در آئینہ تا افتادہ است
شور با ما و من بہ بزم ما سوا افتادہ است

آئینہ در دو رطہ از جوش صفا افتادہ است
طبع روشن ہر کہ میدارد ز پا افتادہ است

کوچہ زلف و شب دیجور در تاریک و تار
دل بیفتاد و نمیدانم کجا افتادہ است

شکوہا دارم ز انداز گران جانی خویش
ہست چون سنگی کہ در راہ وفا افتادہ است

کشتی صبرم بطوفان ہوا افتادہ بود
بر کنار اینک بہ موج بوریا افتادہ است

سایہ بر خورشید افتادہ ست از زلف سیاہ
شعلہ در آئینہ از رنگ حنا افتادہ است

انس بگرفتم ز بس با خانہ ویرانی خویش

سبزهٔ بیگانه با من آشنا افتاده است

شرمسارم عذر بدتر از گناه آورده ام

پردهٔ بر روئے من از دست دعا افتاده است

شور یارب بر لب و دست تظلم بر فلک

شیشهٔ صبر من از بام دعا افتاده است

من همه تن گوش باشم بر صدائے الرحیل

در دو چشم گرد آواز درا افتاده است

ماندگی پائے من سیلے که بر من بسته بود

بر سرم از صدمهٔ شور درا افتاده است

برق را گفتم مجو از نیستی راہ گریز

از میان جست و در آغوش فنا افتاده است

چون الف آہے بکشم و ز ہستی خود بگذریم

در کمند وحدتم صید فنا افتاده است

گردش نه آسمان یک دل نالان من

دانه هست و بدست آسیا افتاده است

انقلاب چرخ نتواند مرا از جا برد

من دلے دارم که قطب آسیا افتاده است

بازآمد تشنه کام از بسکه اسکندر بدید
بیضه اندر چشمهٔ آب بقا افتاده است

نسبتے دارد حدوث دهر بالوح قدم
همچوں آں نقشے که بر آب بقا افتاده است

هر قدر نزدیک تر آید بگردد دور تر
سالک راهش بره چوں نقش پا افتاده است

سرنگوں گشتم ز پیری من کجا و فکر شعر
طرفه مضموں بلندے پیش پا افتاده است

سید هر جام فنا بر کف صلا ضحاک دهر
دور جم آخر شد و نوبت بما افتاده است

نقد فرصت را بیغمامی برد نفس حریص
حیف ازیں فرصے که در کالائے ما افتاده است

ناروائی بهت آفریں دکان اهل فن
نقد معنی چوں متاع ناروا افتاده است

کهکشاں با کج روی تا آسمانها سر کشید
بر زمیں چوں نظم خط استوا افتاده است

بسکه جوشِ اضطرابِ شوقِ برقِ خرمن ست
تا تو دریابی بدامن نیستم خاکِ من ست

از غمِ عشقش سیاسانم تہ این کارِ من ست
خوش ببیفروز بزمِ آتش تا ہوا و روامن ست

تا مرا تاب و توان و ہوشِ خرمن خندن ست
جملہ وقفِ انتظارِ شوقِ برقِ ایمن ست

از کواکب بر سرِ یار ریخت گردِ فتنہا
چرخ گردان آسیا ہست و سپہر پرویزن ست

وہم ہستی بسکہ چشمت را غبار آلود کرد
تا تو می بینی مرا من نیستم گردِ من ست

موسیا وارفتگان گفتگوی یار را
در صدای لن ترانی موجِ برقِ ایمن ست

کاروان اشک خون پیچ گذر بگذشت دوش
نقشِ پایش از سرِ مژہ تا دامن است

نکہت گل را بگفتم سخت می پوشی حیا
گفت مجبورم مرا خونِ وفا بر گردن ست

از ہجومِ ظلمت اندوہ و غم مضطرب

بعد شب صبح است و بعد از صبح روز روشن است

اسراغ حق ہمی گیریم از نامحرماں
کاندریں وادی چراغ راہ چشم رہزن است

درس عبرت را ازیں سیر طریقت یاد گیر
چنگ در بزم طرب محو فغاں و شیون است

میکشد در رہ ترا ایں سعی بجائے سیند
نرد بان دود دل کوتہ ز بام شیون است

طے کند صد سالہ رہ از برگ گل تا آفتاب
بہر شبنم ایں کرامتہا ز قلب روشن است

حاصل عمر خود از بہر تماشا سوختی
نظم ایں جوش طرب رقص شرار خرمن است

۶۰ — ول — ۴

عشق از سوز دل میں طرح آتش خانہ ریخت
آنچہ از آتش گرفت و درد دل پروانہ ریخت

کشتۂ آں ترک ستم کز سر ناز و غرور
کافرم ندا شت و خونم چو بے باکانہ ریخت

چارہ بے خوابیم ناید ز نوائے قصہ خواں

ورد و چشم صد نمک داں شور ایں افسانہ ریخت
کرد چوں خورشید تیغ خونچکانش در نیام
چرخ از شب داغم بکشاد و ز اختر دانہ ریخت

۶۱

ولہ

۱۶

ہوس بہ غم خرد و مدعای دیگر داشت · صبا بدیدہ گل بو و رنگ دیگر داشت
اگرچہ خضر رفیق طریق بود ولے · سلوک منزل دل رہنمای دیگر داشت
نگشتہ ایم مکدر ز صدمۂ نفسے · کہ آب آئینہ [illegible] صفای دیگر داشت
جہانست صفحۂ اعمال مردود نوشتہ ام · کہ لغزش قلمم نقش پای دیگر داشت
صعود کردم تا لامکان و برگشتم · کہ گوشۂ دل روشن فضای دیگر داشت
دلم اگرچہ بجو و ہر چہ کرد بد کردست · ولے خیال نکوئی بجای دیگر داشت
نگو کہ نالہ کشیدیم و برنخواست صدائے · شکست گنبد مینا صدائے دیگر داشت
ز کنج صومعہ ایں جا رسید و برخوردم · کہ کنج میکدہ آب و ہوای دیگر داشت
بجرم عشق تو کشتی مرا و شاد شدم · چرا کہ کشتہ تو خونبہای دیگر داشت
مپرس حال ز خود رفتہ براہ فناست · کہ جادۂ دگر و نقش پای دیگر داشت
بہ زعم من ہمہ بودیم طالب دوست · براہ فتنہ فتادن بلای دیگر داشت
بہ بزم عیش منہ دل بہ شکوہای فراق · حکایت شب غم [illegible]
بہ ہجر رشک بر فتیم و باز گردیدیم · کہ راہ کوچہ او [illegible]

۶۳ —— وله —— ۱۱

کامگاراست هر که ناکام ست | زانکه گیتی طلسم اوهام ست

بدمگو هر که را که بدنام ست | نام او خود بجای دشنام ست

فال باده کشی مزن واعظ | خط پیمانه حلقهٔ دام ست

دین و دنیا بهم نخواهد رفت | طمع جنت و سربسر خام ست

انفعال گناه و حسرت دید | چشم بر پا و جلوه بر بام ست

گردباد یم در راه کوچهٔ دوست | نیت با طواف و احرام ست

آستانش کجا و سجدهٔ ... ما | بوسهٔ عاشقاں بہ پیغام ست

اصل گیتی ست جوشش بادهٔ عشق | کهکشاں حلقهٔ خط جام ست

جست از جا سپند و رمزی گفت | کز عدم تا وجود یک گام ست

بنده آں کسم که در عالم | نیک کردار و نیک فرجام ست

نظم دانسته ام بنا عمر سپهر
صبح کم آغاز و شام انجام ست

۶۴ —— قطعه —— ۵

مرکب ماست کوکب سیار | از سیرش سنین و اعوام ست

او درین راه خویش غلطنده | شام تا صبح صبح تا شام ست

تا ہلال از ہلال یک منزل | تا صباح از صباح یک گام ست

کہ قریب است وگہ بعید از شمس — قرب و بعدش فصول ایام ست
گرچہ بینیم ماہمی بینیم — کز زمین فرش و آسمان بام ست

۶۵ ——— مشاعرۂ صدر اعظم بہادر ——— ۹

ہمہ زخم و درو زلفش شکن اندر شکن است — در خم ہر شکنش نافۂ مشک ختن است
نوبہار است کہ پری خانہ بہ مینا دارم — جنبش بال پری موج شراب کہن است
گشت عمر و ز چمن دور و اسیر قفسم — در دلم نقش ہوا خواہی سرو و سمن است
خواستم تا قو ز زلفش بکشایم در باغ — گفت ہشیار کہ غماز نسیم چمن است
بیگانگیم از صحبت ابنائے زمان — بہ سرم گرد غیر ساو طنی در وطن است
ابر بر کوہی عمر تو می گرید زار — برق ازین رہ کہ تو غافل گذری خندہ زن است
قطرہا بود زمین غرق بخون ناحق — شاہد راز درون لالۂ خونین کفن است
منزل شاد کہ سلک گہرش می گویند — شہرۂ حسن قبولش ز دکن تا عدن است
برتری از دگران اہل سخن را است بجا — جوہر ذاتی انسان سخن است و سخن

۶۶ ——— دلہ ——— ۷

آورد عرض بار امانت جہاں شکست — پشت سپہر تا کمر کہکشاں شکست
موجے چو سیل سر زدہ از قلزم شہود — در وادی سپہر گران تا کران شکست
سیتارہ فراق و گریہ شبہائے تار حیف — بنیان شمع از سر تا استخوان شکست
پیر مغان براہ کرم جرعۂ بداد — کز نشۂ خمار ہستی من جاودان شکست

خم گشت پشت مرد و بدل آرزو بما — تیر کش ہنوز نا شدہ خالی کماں شکست

از قید و بند بود رہے مرغ روح من — تا من رہا شدم قفس استخواں شکست

مرغے بہ پیش ابرہہ رفت و صدا نکرد — کز سنگ ریزہ گردن پیل دماں شکست

٦٧ —— ١٩

حرف ح

دور کھینچے نہ گریباں کی طرح — لوٹ جاؤنگا میں داماں کی طرح

پاؤں پھیلائے میں داماں کی طرح — ہاتھ کھینچا ہے گریباں کی طرح

چل گیا مجھ پہ یہ دو دھار اخنجر — پھر گئی آنکھ بھی مژگاں کی طرح

تیرے عاشق کا یہ دل تھا ظالم — توڑ ڈالا جسے پیماں کی طرح

سر جھکا کر نہ اٹھایا ہم نے — تیغ آئی تیرے احساں کی طرح

میرے غماز کا ہے منہ کالا — میرے ہی نامۂ عصیاں کی طرح

کھاتے ہیں ترک محبت کی قسم — ہاتھ اٹھاتے ہیں وہ قرآں کی طرح

اے قناعت ترے صدقے ہو جاؤ — میں ہوا پر ہوں سلیماں کی طرح

پر کدورت ہے دل زار ایسا — خاک اڑتی ہے بیاباں کی طرح

مجھ کو حیرت ہے کہ خورشید بھی ہے — زرفشاں جلوہ عثماں خلد اللہ ملکہ کی طرح

نظم کے پاس تھا کیا دل کے سوا — کھو دیا اس کو بھی ایماں کی طرح

کیا تھا ابر نے نالہ میری فغاں کی طرح
زمین نکل گئی قدموں سے آسماں کی طرح

الٰہی آج کا ابر اسقدر تو جھک آئے
کہ ڈھانک لے در میخانہ سائباں کی طرح

دکھا رہی ہے مجھے بیخودی نیا عالم
جدا زمیں کی طرح ہے نہ آسماں کی طرح

کوئی نشاں نہ ملا کس طرف گئے احباب
بھٹکتے رہ گئے ہم گرد کارواں کی طرح

نزول رحمت باری ہے آج کثرت سے
کہ ابر کشتی مے پر ہے بادباں کی طرح

دل و جگر کبھی کا ہو گئے یوں تیر تجھے
نہ جانے کس کی نظر لگ گئی سناں کی طرح

جہاں میں صاحب ہمت کی یہ نشانی ہے
عروج پا کے بھی جھکتے ہیں آسماں کی طرح

سوا انہوں کے ہستی دہر کچھ بھی نہیں
یہ حلقہ ہیچ سے خالی ہے کہکشاں کی طرح

٦٨ —— ١٠

اس مہینہ میں کہاں تھا ساقیا اچھی طرح
آ ادھر آ عید تو مل لیں ذرا اچھی طرح

انگلیاں کانوں میں رکھ کے اے مسافر سن ذرا
آ رہی ہے صاف آواز درا اچھی طرح

چشم موسیٰ لا سکی اک بار اسکے جلوہ کی نہ تاب
چشم دل سے جسکو دیکھا بارہا اچھی طرح

فاصلہ ایسا نہیں کچھ عرش کی زنجیر سے
کیا کہوں ٹھہرتا نہیں دست دعا اچھی طرح

اہل صورت کو نہیں ہے اچھی سیرت سے غرض
اچھی صورت چاہیے اچھی ادا اچھی طرح

قاصدان لالہ و گل کی خبر لائی ہے کچھ
سال بھر کے بعد آئی ہے اے صبا اچھی طرح

سیکھ لیگی بل کی لینا تا مگر آنے تو دو
بل ابھی کرتی نہیں زلف دوتا اچھی طرح

شیشہ و جام و سبو بھر لے مے گلرنگ سے
آج ساقی گھر کے آئی ہے گھٹا اچھی طرح

۱۱

حرف د

نظر پڑا جو مجھے دام شکل صیاد
ہوئی ہے دل کو اسیری کی آرزو صیاد

نہ بو سے گل کے غرض ہے نہ صوت بلبل سے
تو باغباں ہے مخالف ہے عدو صیاد

چمن میں مجھ سے اسیری کے ہر طرف تھا ہجوم
نکل سکی نہ مرے دل سے آرزو صیاد

یہ آرزو بھی نہ پوری ہوئی اسیری کی
سنائیں اپنی کہانی سنے جو تو صیاد

یہ گل فروش ادا ہی تو ہوتے ہیں گلچیں
وہ آج صید میں اور جوش آرزو صیاد

کھیا ہی لطف اسیری نے مست بلبل کو
قفس ہے کیا مجھے گلرنگ کا سبو صیاد

لپٹ کے سرو سے قمری یہی تو کہتی ہے
پھری تلاش میں پھرتے ہیں کو بکو صیاد

گرہ ہوئی ہیں رگ و ریشے جا بجا نالے
گلو نے نے کی طرح ہے مرا گلو صیاد

قفس میں یاد چمن کی یہ [illegible] گل کھلاتی ہے
بنا ہے لالہ و گل خون آرزو صیاد

فغاں کہ نیچے گھٹ گھٹ کے میں تمام ہوا
گلے کی ہو گئی پھانسی رگ گلو صیاد

ہمیں تو اپنی رہائی سے یاس ہے اکم
کرے غضب کا فسوں ساز و حیلہ جو صیاد

۱۰

آئینہ از پرتو او وادی ایمن شود
چشم آہو از نگاہش دیدہ روزن شود

حیف ازاں ساعت کہ خود نفس تو آہرمن شود
خوشترآں کس کو رہا از بند ما و من شود

عشوہ او تیغ چوں برمن کشد ہنگام وصل
از دو گیسویش گرہ بکشائم و جوشن شود

اے کہ شمع مدفنم گشتی توقف کن کہ تا
شمع کشتہ باز از سوز دلم روشن شود

اف ازیں سوز نہانیہا کہ دل را خاک کرد
ہمچوں آں پرکالۂ آتش کہ در گلخن شود

نیست امکاں مفر از کوچۂ گیسوے او
جادہ بر خود پیچد و چوں افعیم رہزن شود

مایۂ صد گمرہی باشد دل صد آرزو
رہگزارش را چراغ از چشم آہرمن شود

کس نمی پرسید از حال من اے برق بلا
خندہ بر من زدی اے چشم تو روشن شود

بادیہ گردی من پوشید عریانی من
گرد رہ در رہ قدم بر خیزد و دامن شود

لذتے دارم چناں از کاوش مژگاں تو

شبنمم نشتر بدل گرہاں شیون شود

۶۲ ۱۲

جوش سرشک تا سر مژگاں نمی رسد / وز خون دیده گل بگریباں نمی رسد

بالاتر است جلوه او از فراز عرش / آنجا نگاه موسی عمراں نمی رسد

تا آنکه خود فنا نشود در ره طلب / شبنم به اوج نیر تاباں نمی رسد

ابر سیاه در نظر جذبه شوق است / این گرد سرمه تا به صفاهاں نمی رسد

زنجیر عرش هست و ندانم ز بهر چیست / آنجا که دست سلسله جنباں نمی رسد

دیدند اهل دل ثمر قد کشی سرو / آری سر غرور به ساماں نمی رسد

تا دست و پا بموج تبسم نمی زند / طفل شگوفه تا گل خنداں نمی رسد

در کارواں و هر بند بند یوسفی / گرچه بر آمدست و بزنداں نمی رسد

دامن کشاں گذشت سر گشتگان خویش / دست کسے بگوشه داماں نمی رسد

ما هم و طوف دشت و بیاباں چو گرد باد / دیں خاک ما عمر گریزاں نمی رسد

بے راهبر مباش که این کارواں گل / بے سعی نامیه به گلستاں نمی رسد

هر چند تیز گرد بود دانه شبه / تا آب گوهر غلطاں نمی رسد

بدام این نفس از افسوں نه از افسانه می آید
چنیں کار سترگ از همت مردانه می آید

بیک اشک ندامت مزرع اخلاص شاداب است
سر شاخ مژه خرمن بدوش این دانه می آید

دهد تا افسرده جام صبوحی مے پرستاں را
بیک شب گیر ابر از کعبه تا میخانه می آید

اگر ضبط نفس شرط است در میخانه عرفاں
که بے قلقل شراب از شیشه در پیمانه می آید

عیاں انداختم از شعله شمع است ایں معنی
ہوائے خوش زباں افشانی پروانه می آید

براه دوست عاشق از سر جاں بگذرد آرے
بسر غلطیدنی از گوہر یک دانه می آید

فغاں از مستی ساقی که دیدم کشتی مے را
کنار جو بموج لغزش مستانه می آید

دریں زنداں تن از دم شمردن نہانیا سایم
نسیم جانفزا از کوچه جانانه می آید

سزد گر سرکشد از بندگی نفس
بشر در عالم ایجاد آزادانه می آید

ز حد خود گذشتن نیست کار باده پیمایاں

کہ جوشِ بادہ ایں جا تا خطِ پیمانہ می آید

بگردوں تیرہ ابرے بر شد و مستند میخواراں
کہ پندارند بر دوش ہوا میخانہ می آید

ز احوال سویدائے دل مضطر چہ می پرسی
کہ چوں اسپند در پرواز بیتابانہ می آید

ز پاس وضع رنداں نگزرم تا اندریں محفل
اقامت از صراحی گردش از پیمانہ می آید

فروغ حسن داشتن ناگزیر اسباب رسوائی
کہ ہر جا شمع روشن می شود پروانہ می آید

کلام بے ہنر کز گنج معنی ہست بے بہرہ
صدائے بوم را ماند کہ از ویرانہ می آید

نمی آید ز ہر کس رام کردن نفس سرکش را
چنیں کار سترگ از ہمت مردانہ می آید

فراشش تا کنم اے نظم از دل گریہ مینا
بگوشِ من صدائے خندۂ پیمانہ می آید

حرف ر

فاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات

نگاہِ ناز سے کل گر نکلے بسمل پر
یہ وہ خدنگ ہے آتا ہی چھوٹتے دل پر

نظر ٹھہرتی نہیں روئے یار کے تل پر
چمک رہا ہے ستارہ سا ماہِ کامل پر

جہاں کی پہلی مصیبت ہی گردشِ فلکی
وہ بحر ہے کہ بھنور پڑ رہا ہے ساحل پر

ملک چھپکتے ہیں ہے منہدم بنائے جہاں
کھڑی ہوئی ہے عمارت آبگینوں پر

نوائے شادی و غم دونوں ہیں تجھی دشمن بدل
کہ پس گیا گل نغمہ کفِ جلاجل پر

گیا تھا میں ابھی طے کر نہ وادیِ غربت
کہ ہو چکی شامِ غریباں سوادِ منزل پر

ہمیں تو قلزمِ ہستی سے تھی عبور کی فکر
نہنگ بن گئی ہر موج آ کے ساحل پر

ملی نہ غمکدۂ دہر میں جگہ اتنی
کہ روؤں بیٹھ کے میں نامرادیِ دل پر

اوتر کے بام سے آیا نہ پھر وہ رونقِ بزم
وہ نور پھر کبھی اترا نہ شمعِ محفل پر

چلی ہے دہر میں کیسی ہوائے بیدردی
کہ ہو رہی ہے ہنسی نالۂ عنادل پر

تو ہم سے سیکھ لے اے قیس طرزِ بیتابی
اتار لیتی ہیں لیلیٰ کو چڑھ کے محمل پر

الجھ کے دور و تسلسل میں رہ گئی جو لو
اونہیں ہے رشک سرِ طوق و سلاسل پر

پکارتی ہے یہ حسرت کہ ذبح کر کے مجھے
دیا ہے خون کا ٹیکہ جبینِ قاتل پر

جو یاد آ گئی ہے میرے دل کی بیتابی
پھڑک رہی ہے وہ اندازِ مرغِ بسمل پر

نہ پوچھو قافلہ والو یہاں کا کوچ و مقام
کہ اک رکاب میں ہے پاؤں اک منزل پر

یہ بے ثباتیِ سازِ طرب پکارتی ہے
کہ نغمہ رنگِ حنا ہے کفِ جلاجل پر

طوافِ شوق کو سیکھو انہیں پتنگوں سے
تڑپ رہے ہیں جو گر گر کے شمعِ محفل پر

نہیں مقام کا اس جلتی چھاؤں میں موقع
نہ بیقرار ہو عمر ناپہنچ کے منزل پر

ملا طریق وفا میں جو کوئی سنگ گراں
اٹھا کے راہ سے میں نے وہ رکھ لیا دل پر

نگاہ ناز کا مطلب ہے کیا نہ کچھ سمجھا
چھری جگر پہ کوئی اب لگائیے یا دل پر

ہزار شکر کہ افعال میں تو جبر نہیں
ہزار حیف نہیں اختیار ہی دل پر

لگا دے تیر کے پر مجھ کو بیقراری دل
کر مت کے محمل میں گروں جا کے اپنی منزل پر

سے غبار کو جھٹکو نہ قافلے والو
کہ ٹھوکروں میں یہ پہنچ جائیگا یہ منزل پر

کسی کو قبر میں بھی چین نہ پائیگا کوئی
کہ تین دن کے ہیں مہمان پہلی منزل پر

کجا وہ جلوہ گہ ناز تو کجا اے نظم
یہ آرزو تجھے اس حوصلہ پہ اس دل پر

۷۵ ــــ فاعیل مفاعیل مفاعیل مفاعیل ــــ ۱۷

گو چہ کوئی نکلے جو رگ جاں کے قریں اور
اس گنبد بے در سے نکل جائیے کہیں اور

ہو سکتا ہے عالم میں جو ہو مہ جبیں اور
تجھ سا تو تصور میں بھی عالم کے نہیں اور

دل لیکے ستمگار ہوا ہے سر کیں اور
دو دل جان تو ڈر ہے کہ وہ بگڑے نہ کہیں اور

اللہ رے ساقی کا یہ بد ہو کے بلانا
کہتا ہوں کہ بس بس تو وہ کہتا ہے نہیں اور

زاہد ہے مرے اور ترے سجدہ میں بڑا فرق
شوق اور ہوس اور ہے دل اور ہے دیں اور

کوثر پہ بھی زمزم پہ بھی گذرا ہے تو واعظ
دیکھے ہیں کہیں ہم نے خرابات نشیں اور

خط لیکے جو قاصد ترا آیا تو میں سمجھا
لائے ہیں صحیفہ کوئی جبریل امیں اور

اس چھیڑ میں کوئی جو تڑپتا ہو تو مر جائے
وعدہ ہے کہیں اور ارادہ ہے کہیں اور

او قاتل بے رحم کوئی وار ادھر بھی
محروم رہا جاتا ہے اک خاک نشیں اور

مر کر بھی ہمیں صور قیامت کا ہے کھٹکا
باقی ہے ابھی اک نفس باز پسیں اور

مرقد میں گرا جاتا ہوں میں بار گنہ سے
جھکتا ہے تہ گردوں تو دبا تی ہے زمیں اور

وہ داغ جو قسمت میں لکھا ہے نہیں مٹتا
گھستا ہے جبیں سا تو ملتی ہے جبیں اور

اوڑنے میں لپکتے ہیں ہے شعلہ ترا توسن
ہے پھیر کے دیتا ہے ہوا دامن زیں اور

خوشبو سی یہ نہیں ہے شب وصل کی شب بھی
گیسو پہ ہے کس کے یہ ہم تو کھلا نافہ چیں اور

کوچے میں ہے تیرے غم عالم سے رہائی
پاتا ہوں ہوا اور فلک اور زمیں اور

تیر نگہ ناز نے کیا معرکہ ڈالا
سینہ ہوں کہیں بسمل جگر و دل ہیں کہیں اور

وہ محفل ارباب صفا ہو گئی برہم
ان لوگوں میں باقی ہے اک [illegible] اور

۷۶ —— مفعول فاعلات مفاعیل فاعلات —— ۱۵

احسان لے نہ ہمت مردانہ چھوڑ کر
رستہ بھی چل تو سبزۂ بیگانہ چھوڑ کر

مرنے کے بعد پھر نہیں کوئی شریک حال
جاتا ہے شمع کشتہ کو پروانہ چھوڑ کر

ہونٹوں پہ آج تک ہیں شب عیش کے مزے
ساقی کا لب لیا لب پیمانہ چھوڑ کر

افعی نہیں کھلی ہوئی زلفوں کا عکس ہے
جاتے کہاں ہو آئینہ و شانہ چھوڑ کر

طول امل پہ دل نہ لگانا کہ اہل بزم
جائیں گے ناتمام یہ افسانہ چھوڑ کر

لبریز جام عمر ہوا آ گئی اجل
لو اٹھ گئے بھرا ہوا پیمانہ چھوڑ کر

اس پیر زال دہر کی ہم ٹھوکروں میں تھا
جب سے گئی ہے ہمت مردانہ چھوڑ کر

پھیروں ہمارا آپ میں آنا محال ہے
کوسوں نکل گیا دل دیوانہ چھوڑ کر

اوترا جو شیشہ طاق سے زاہد کا ہی چلا
کرتا ہے رقص سجدۂ شکرانہ چھوڑ کر

پیمانۂ دریا تو نشانی ہے کفر کی
زنار باندھ سبحۂ صد دانہ چھوڑ کر

رندان میکدہ بھی ہیں اے خضر منتظر
بستی میں آئیے کبھی ویرانہ چھوڑ کر

احسان سر پہ لغزش مستانہ کا ہوا
ہم دو قدم نہ جا سکے میخانہ چھوڑ کر

وادی بہت مہیب ہے بیم و امید کا
دیکھیں گے شیر پہ دل دیوانہ چھوڑ کر

رو رو کے کر رہی ہے صراحی وداع اور
جاتا ہے دور دور جو پیمانہ چھوڑ کر

توبہ تو کی ہے نظم نباہو گی کس طرح
کیونکر جیو گے مشرب رندانہ چھوڑ کر

۱۵

بت کہتے ہیں کبھی کبھی تصویر دیکھکر
سوجھی ہے دل لگی مجھے دلگیر دیکھکر

للّٰہ آئینہ سے بھی پردہ کیا کرو
ڈرتا ہوں میں نگاہ میں تاثیر دیکھکر

پہلو سے دو گھڑی نہ سرکتے تھے جو کبھی
گھبرا رہے ہیں دفن میں تاخیر دیکھکر

سایہ کے ساتھ دھوپ بھی شرما کے ہٹ گئی
زلفوں میں روئے یار کی تنویر دیکھکر

عالم سے مجھکو صانع عالم کی یاد ہے
معمار کا خیال ہے تعمیر دیکھکر

سمجھے مری دعا کو ملک نردبان عرش
بیہم صعود نالۂ شبگیر دیکھ کر

دوزخ میں اے کریم میں کیونکر گلہ کروں
تعزیر دی تو لائق تعزیر دیکھ کر

نالہ کی اپنے بے اثری یاد آ گئی
تڑپا ہیں صید کو ہدف تیر دیکھ کر

گردوں پہ ہے حداثت سن کا یقین مجھے
بیہم یہ انقلاب یہ تغییر دیکھ کر

وہ ہیں غرور حسن سے ضحاک روزگار
شانوں پہ اپنے زلف گرہ گیر دیکھ کر

سفاک خلق تجھ کو خدا نے بنا دیا
اہل جہاں کو لائق تعزیر دیکھ کر

خالق عطا کرے مجھے دیوانگی عشق
آنکھیں بچھاؤں حلقۂ زنجیر دیکھ کر

جب دل الٹ چکا تو ہوئے ہیں وہ مہرباں
اب کڑھ رہے ہیں پاؤں میں زنجیر دیکھ کر

پھر اگلا ہے ہاتھ مرا انکو کیا غرض
بازو سے کیوں لپٹ گئے شمشیر دیکھ کر

اے نظم تجھے فلک کے ستم کا گلہ نہیں
کرتے ہیں شکر خواہش تقدیر دیکھ کر

۷۸ ـــــ فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلات ـــــ ۱۷

مجھ کو یارب تو عطا کر دل نالاں دوچار
دل ہوں دوچار تو ہر دم ملیں ارماں دوچار

اے جنوں مجھکو دکھا عالم امکاں دوچار
شش جہت کو میں سمجھتا ہوں بیاباں دوچار

گیسوؤں میں ہے شب وصل کا نقشہ باقی
کچھ گندھی رہ گئیں زلفیں تو پریشاں دوچار

میں ہوں وہ کشتۂ حسرت کہ لحد پر میری
اڑتے پھرتے ہیں حسینوں کے گریباں دوچار

شادی و غم کو یہ مانا کہ بہم ہیں لیکن — سیکڑوں دہر میں گریاں ہیں تو خنداں دو چار
نہ تو ہم تھے نہ کیا کچھ نہ کہا کچھ ہم نے — تہمتیں چند لگائی گئیں بہتان دو چار
سایۂ سرو میں بیٹھے ہیں کہ آزاد ہیں ہم — کاٹ دینگے اسی کما میں زمستان دو چار
رات اندھیری تھی مگر سیکڑوں تارے ٹوٹے — آئی تھی خون کے آنسو سر مژگاں دو چار
ایک دو انکی گرہ میں ہیں بہت سی خرمن — ایک غنچہ کی بغل میں ہیں گلستاں دو چار
لاکھ صدمے ہوں مگر عشق کا ایسا ہی مزا — کہ ہزاروں میں ہوئے ہونگے پشیماں دو چار
کیا ملا تجھکو صبا پھول کے غنچہ کی گرہ — نکلے دو چار جو دامن تو گریباں دو چار
اتنے فرقے ہوے کس طرح مسلماں نکلے — یہ تو معلوم ہے اوترے نہیں قرآں دو چار
اپنے ساحل پہ جگہ دے ہمیں اے بحر کرم — تشنہ لب جھیل کے آئے ہیں بیاباں دو چار
پیکر خاک کجا اور کجا عقل و ہوس — اوترے ہیں منزل خاکی میں یہ مہماں دو چار
غم ہے کیوں زردی تو دیکھ تماشائے جہاں — رنگ بدلے گی ابھی گردش دوراں دو چار
کوچۂ تنگ میں ہیں سیکڑوں مضمون صفیں — میرے خامہ کو بھی چاہئیے میداں دو چار

اس زمیں میں کہے ہیں اشعار میں جاصل اے نظمؔ
آسماں بھر میں ستارے ہیں درخشاں دو چار

۶۹ — ۲۶

رو دئے ناصح بے درد کے سمجھانے پر — ہنس دئے راز غم عشق کے کھل جانے پر
ناز کرتا ہے فلک ظلم و ستم ڈھانے پر — اور زمیں پاؤں کے نیچے سے نکل جانے پر

بادہ خواری کا برا ہو کہ ہی اوقات اب تو
مے گرے گر جانے پہ ساغر کے چھلک جانے پر

نامۂ شوق کا طومار تو پڑھ کر دیکھو
رقص کرتا ہے کبوتر مرے افسانے پر

اے نسیم سحری کس سے یہ شکل ہے والا
چاک ہوتے ہیں گریباں ترے اٹھلانے پر

زرفشاں ہونے کو ناحق نکل آیا خورشید
ابر آمادہ تھا گلشن باغ میں برسانے پر

کیا خبر کون ہے بیہوش یہاں آپ ہیں کون
وہ بھی دیوانے ہیں جو ہنستے ہیں دیوانے پر

ہمہ تن گوش تو ہیں گل مگر اے مرغ چمن
کان رکھتا بھی ہے کوئی [illegible]

ایک جلوہ کے سوا کچھ نہ دکھائی نظمی
بیخودی بزم میں چھائی رہی پروانہ پر

۸۰

دوش پر تیرے ہیں افعی کبھی رخسار پہ نیر
تاک انگور ز رشتوں سے یہ چھڑی تھی گلک
بھیڑکی تھی لب جاں بخش کا شہر سخن
ہیں وہ نالاں ہوئے کیہ بین کی پیدا آواز
رحم مجھ پر تو نہ آیا تجھے مرتے مرتے
یا نہیں گر دشمن مری [illegible] دے تو دیکھ شراب
تلف عمر پہ زار ہے پریشاں کیسا
جوش سودا میں یہ آتش قدمی تو دیکھو

۸۱

خود ستمگر ہو عنایت ہے ستمگاروں تک
آج تو پھاند پڑی باغ کی دیواروں تک
چشم فتاں نے چھری پھیر دی تلی زن تک
ہاتھ دوڑاؤں گریباں کے گریباں زن تک
مہربانی ہے یہ کیوں تیر عزاداروں تک
منہ جو پوچھوں ہی تو ملکر ترے رخساروں تک
دیکھا رحمت کو اترتے جو گنہگاروں تک
کہ میں شعلہ کی طرح دوڑ رہا ہوں خاروں تک

رکھتے ہیں ابرو و عارض صفتِ تیغ و ترنج
لو چھری پھر گئی یوسف کے خریداروں پر

ہوس لذتِ بیداد نہ پوچھو مجھ سے
دل جب آتا ہی تو آتا ہے دل آزاروں پر

لطف یہ ہو ابھی کھنچی نہیں اُسنے تلوار
ٹوٹ پڑتے ہیں گنہگار گنہگاروں پر

باغ سی قوس قزح کی نظر آتی ہی طناب
خیمۂ زر ابر ہوا آکے جو کہساروں پر

ہو گیا مستو کی جھرمٹ میں جو خورشید غروب
سرخ ہیں رنگ شفق پھولی ہی رخساروں پر

سختیاں عشق کی جسطرح ہیں جھیلیں کی
ہم نے دیکھی ہی تجلی انہیں کہساروں پر

بڑھ گئی کس کی سواری فلک ہفتم سی
رشک جبریل کو ہے غاشیہ برداروں پر

جب سی دیکھا تجھی انگشت شہادت کیطرح
انگلیاں اٹھتی ہیں یوسف کے خریداروں پر

ایسے نالوں کو جو کوٹھے پہ نہ آئے دولھا
چاندنی سب [illegible] لگا دیواروں پر

دل تڑپتا ہے یہ شاید کسی دیوانہ کا
آج کوندا نظر آتا ہے جو کہساروں پر

لالہ پھولا تو یہاں آگ بھڑکی سر سوں پھولی
آج وہی چھائی گھٹا دیکھ کے گلزاروں پر

سختیاں طالب دیدار اٹھاتی ہیں عبث
ٹھوکریں کھاتے چلے موسیٰ انہیں کہساروں پر

نالے بے سود ہی فریاد ہی بیکار اے نظم
رحم آئیگا نہ ظالم کو گرفتاروں پر

٨١ — ١٦

کروٹوں میں [illegible] پاس پہلو کی شب ہجر کیونکر
اُڑ گیا یار کی گلیوں میں مرا دل کیونکر

جذب دل کھینچ [illegible] لیلی [illegible] کو ہم
[illegible] تو آتی ہے محمل بس محمل کیونکر

گورے گالوں پہ جو سرخی ہے تو نظر شکل ہے
پاگئی راہ فنا تو تو تڑپ کر کے برق
مجھ سے تو ضعف سے کروٹ نہیں لی جاتی
کس طرح باغ میں بہلے گا دل زار اپنا
ہمت پیر مغاں کی ہے کرامات یہ سب
تین دن تو ہی ظلمات میں کشتی ہلال
برق رفتار ہی کیا قافلۂ عمر رواں
دل کو رکھونگا میں اب باندھکی زنجیروں میں
موج دریا سے یہ عبرت کا فسانہ سن لو
کچھ غبار سر رہ کو یہ خبر ہے معلوم
کچھ خبر شمع فروزاں کو ہے پروانہ کی
دل پر درد تو شیشہ سے سوا ہے نازک
میں ہوں بیمار غم اور عمر کی منزل ہے پہاڑ
دور گردوں میں ہے بیقدری اسباب زیاں

ہیں پریشان بہوں کا جلے بتی دل کیونکر
دیکھیں ملتا ہے کہیں جادہ منزل کیونکر
ہوں یہ حیران تڑپتا ہے مرا دل کیونکر
اور بستی جا بسنگی فریاد عنادل کیونکر
ابھی خالی تھی ابھی بھر گئی محفل کیونکر
آگئی ڈوبتی تیرے لب ساحل کیونکر
ایک دم میں یہ گیا سیکڑوں منزل کیونکر
دیکھتا ہوں کہ تڑاتا ہے سلاسل کیونکر
کشتیاں ڈوب گئی ہیں لب ساحل کیونکر
قافلے لٹ گئے آ کر سر منزل کیونکر
ایک جلوہ میں یہ سب ہو گئے بسمل کیونکر
اب کہو صبر کی چھاتی پہ دھروں سل کیونکر
ناتوانی میں کروں قطع مراحل کیونکر
جائے حسرت ہے کہ جیتا ہے یہ قاتل کیونکر

۸۴

دھوکا زلفوں نے دیا عنبر سارا بن کر
مرض عشق میں سو مرتبہ میں مر کے جیا

۱۴

سحر آنکھوں نے کیا نرگس شہلا بن کر
پوچھ پروانوں سے جو بیٹھے ہیں مسیحا بنکر

ہوگئی زلف پریشاں تو کمر سے اسکی — حلقۂ زلف لپٹ کر لگے چھلا بن کر

دن بھی نکلا تو بلائے شب فرقت نہ ٹلی — پیچھے دوڑا مری سایۂ شب یلدا بن کر

پی لیا تھا جو مرا خون تری ناوک نے — منہ سے سوفار کے نکلا وہ کلیجا بن کر

اسقدر خاک میں پنہاں ہیں تپاں سے ہو — گرد باد اوٹھے تو رہ جائے کلیا بن کر

ہر طرح کی حرکت نام کو ہم رکھتے ہیں — اوٹھتے ہیں مٹتے ہیں نقش کف پا بن کر

اب مجھے صبح قیامت کی بھی امید نہیں — گر فلک سر پہ گرا ہے شب یلدا بن کر

لاکھوں ہی شیشۂ دل نور ازل سے چور ہوئی — تب یہ تیار ہوا گنبد مینا بن کر

سبحۂ حضرت واعظ یہ نہ تھا مجھکو تو یوں — گر گلا گھونٹ ہی ڈالے گا یہ پھندا بن کر

میری تصویر کھچی گر تری تصویر کے ساتھ — دیکھ لینا کہ بگڑ جائیگا نقشہ بن کر

باغ تو خوب ہی حسرت نے لگایا ہے مگر — مٹ نہ جائے کہیں دیکھو یہ گھروندا بن کر

خاکساروں کا تری شوق میں اوٹھا تھا غبار — رہ گیا ہے یہ وہی عرش معلی بن کر

کیا ہوا ہی نظم بیاں صبر و قناعت کا مزہ
نعمتیں مجھ پہ یہ اتریں من و سلوی بن کر

---

۸۳ — ۱۲

ور دنداں تہ چھپے صاعقہ افگن ہو کر — یا کنول بجھ گئی الماس کے روشن ہو کر

بھیس ملے ہوئے رہتی ہی قضا عاشق کی — عشوہ ہو کر کبھی ناز کبھی چتون ہو کر

کیا سیاہی شب ہجر انھیں ہے کیا تاریکی — رہ گیا [illegible]

وہ نہیں ہیں تو زمانہ ہے نظر میں اندھیر
شمع منہ اپنا ہی دکھا کرے روشن ہو کر

وصل سمجھوں کہ سو ہجر میں اے بندہ نواز
دور رہتے ہو قریب رگ گردن ہو کر

ہے غرور اہل جہاں سے کہ ملا ہے ہم کو
جادۂ منزل عرفاں رگ گردن ہو کر

نگہ ناز نے تاراج کیا خانۂ دل
چور بنکر کبھی لوٹا کبھی رہزن ہو کر

نامرادی کا میں خوگر تھا بر آئی جو مراد
شکر منہ سے مرے نکلا بھی تو شیون ہو کر

گردشیں چرخ کی سر پر نہ ہوئیں جب مجھ سے
آ گئے قدموں پہ گریں حلقۂ آہن ہو کر

ماہ نو دیکھ کے اوس ترک کماں ابرو کو
مل گیا خاک میں نقش سم توسن ہو کر

سخت مشکل ہے جو اوٹھی دیکھ کے حالت میری
نالے کرنے لگی زنجیر بھی آہن ہو کر

لکھنؤ گردش گردوں نے چھڑایا اے نظم
دور پھینکا مجھے آخر کو فلاخن ہو کر

٤٨ — ١٦

سرو قد حشر اٹھا قامت دل جو ہو کر
فتنے بیدار ہوئے نرگس جادو ہو کر

شام ہی سے یہ شب عیش کا عالم دیکھا
تا کمر آ گئی طول شب گیسو ہو کر

صبح ہوئی شب عشرت ترے صدقے جاؤں
ڈھانک لے چہرۂ خورشید کو گیسو ہو کر

سنتیں مان رہا ہے مری مرنے کی فلک
سر پہ آئی جو بلا رہ گئی گیسو ہو کر

لب پہ ہے مہر خموشی کی مگر آنکھوں سے
حسرت دید ٹپک پڑتی ہے آنسو ہو کر

حسرتیں دل کی نکلیں مری لیکن نکلیں
کبھی آہیں کبھی نالے کبھی آنسو ہو کر

یک بیک چمک اٹھا سینہ جو آئی شب وصل
شعلۂ شمع اڑا جاتا ہے جگنو ہو کر

داغ سودا نے لگایا کہیں آزادہ روش
چمنستاں میں نہ بھی تو سبزۂ لب جو ہو کر

لے گیا عہد جوانی نہ ہمیں ساتھ افسوس
ڈھونڈتے رہ گئے گرد رم آہو ہو کر

راہ میں خشک زراعت بھی نہ دیکھی ابر
کیا برستا ہوا جاتا ہے لب جو ہو کر

لے گئی عرش معلی پہ مجھے فکر سخن
جا پڑی پر تو آئینہ زانو ہو کر

بسبب قتل کیا پھیر کے چتون اس نے
چل گئی دل پہ چھری جنبش ابرو ہو کر

آئینہ اس کو دکھائے جو لگا جوش شکر
رہ گیا سکتے میں وہ سرو لب جو ہو کر

دل اگر ایک طرف ہے تو جگر ایک طرف
تولتی ہے نگہ ناز ترازو ہو کر

مجلس یار میں مہماں سے نہ اٹھیں گے ہرگز
پاؤں اب توڑ کے بیٹھے ہیں وہ زانو ہو کر

قدر ای نظم کسی نے بھی نہ جانی ہرگز
دامن دشت میں مہکا گل خود رو ہو کر

۵ بحر —— فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات —— ۱۲

آستیں تو نے چڑھائی ہے مری تعزیر پر
کچھ بتاؤ تو سہی آخر یہ کس تقصیر پر

پانی اس صحرا میں نایاب ہے زخمی کو یہاں
ایک قطرہ آب اگر دیکھا تو نوک تیر پر

آن ہے جن کی طبیعت میں عجب مشکل پسند
ہر قدم اس کارواں کا ہے دم شمشیر پر

سعی لاحاصل رہی ہے باز آ شکار نہیں
[illegible] ہر اک تصویر پر

صبر کی تلخی میں بھی لذت ہو وہ موافق
کھینچو کی طرح جو گزرے ہیں شہد و شیر پر

دل میں تھا صفا کے خود صید ہوجانیکا خوف
ٹوپیاں ونٹی چڑھادیں دیدہ نخچیر پر

پھیلے تو وہ گذر جو کچھ ہے عزم بلند
بعد اسکے کر بھروسا خواہش تقدیر پر

اپنے خرمن پر تسلط دیکھتے ہیں غیر کا
ہے بھروسا ہم کو برق نالۂ شبگیر پر

خوف رسوائی سے اٹھتی ہے صدا جھنکار کی
گر کسی کی آنکھ پڑتی ہے مری زنجیر پر

خاک کی چٹکی ہے کافی خاکساروں کیلئے
کیا دوا ہر درد کی موقوف ہے اکسیر پر

کہنے سننے کا اثر اغیار پر ہوتا نہیں
آ رہا اہل وفا کا فیصلہ شمشیر پر

جانتا ہوں میں کجا خاک درِ جاناں کجا
نظم مجھ کو ناز ہے اس خوبی تقدیر پر

۸۶ مفاعلن فاعلن فعولن دو بار ۱۸

ہنسی میں وہ بات میں نے کہدی کہ رہ گئے آپ دنگ ہوکر
چھپا ہوا تھا جو راز دل میں کھلا وہ چہرہ کا رنگ ہوکر

ہمیشہ کوچ و مقام اپنا رہا ہے خضر رہ طریقت
رکا تو میں سنگ میل بنکر چلا تو آوازہ زنگ ہوکر

نہ توڑتے ارسی اگر تم تو اتنے یوسف نظر نہ آتے
یہ قافلہ کچھ لائی ساراشکست آئینہ رنگ ہوکر

شباب و پیری کا آنا جانا غضب کا پردرد ہے فسانہ
یہ رنگینی بن کے گرد حسرت وہ اڑ گیا رخ سے رنگ ہوکر

کبھی زنِ پیرزال بنکر کبھی بتِ شوخ و شنگ ہو کر

اٹھے تھے تلوار کھینچ کر تم تو پھر تامل نہ چاہیے تھا
کہ رہ گئی میرے دل کی حسرت شہیدِ تیغِ درنگ ہو کر

جو ولولے تھے وہ دب گئے سب ہجومِ لیت و لعل میں چھپ کر
جو حوصلے تھے وہ دل ہی دل میں رہے دریغ و درنگ ہو کر

۱۳ مفاعیلن ۴ بار ۸۷

جنوں کے ولولے جب گھٹ گئے دل میں نہاں ہو کر
تو اٹھے ہیں دھواں ہو کر گرے ہیں بجلیاں ہو کر

کچھ آگے بڑھ چلے سامانِ راحت لامکاں ہو کر
فلک پیچھے رہا جاتا ہے گردِ کارواں ہو کر

کسی دن تو چلے اے آسماں بادِ مراد ایسی
کہ اتریں کشتیِ عمر پر گھٹائیں بادباں ہو کر

نہ جانے کس بیاباں مرگ نے ہستی نہیں پائی
بگولے جا رہے ہیں کارواں در کارواں ہو کر

وفورِ ضبط سے بیتابیِ دل بڑھ نہیں سکتی
گلے تک آ کے رہ جاتے ہیں نالے ہچکیاں ہو کر

اگر گیراب تو ایسا انقلابِ رنگِ عالم ہے

کہ نغمے نکلے منقارِ عنادل سے فغاں ہو کر

جو ہو کر ابر سے مایوس خود سینچیں کبھی دہقاں

جلادیں کھیت کو پانی کی لہریں بجلیاں ہو کر

جہاں میں شادیِ خاطر کے ساماں ہو گئے لاشے

جگہ راحت کی ناممکن ہوئی ہے امکاں ہو کر

ہنسے کوئی نہ بجلی کے سوا اس ابرِ ماتم میں

اگر بہہ جائے سارا کھیت کشتِ زعفراں ہو کر

الم میں آشیاں کے اس قدر تنکے چنے میں نے

کہ آخر باعثِ تسکیں ہوئے ہیں آشیاں ہو کر

گھٹائیں گھر کے کیا کیا حسرتِ فرہاد پر روئیں

چمن تک آ گئیں نہریں پہاڑوں سے رواں ہو کر

دلِ شیدا نے پایا عشق میں معراج کا رتبہ

یہاں اکثر بتوں کے ظلم ٹوٹے آسماں ہو کر

جو ڈرتے ڈرتے دل سے ایک حرفِ شوق نکلا تھا

لہ مایوس فارسی والوں کا تراشا ہوا لفظ ہے اور [illegible] علاوہ عالم [illegible] صحیح ہے اور اب اردو میں بھی مستعمل ہو گیا ہے۔ اسے فارسی میں نہیں استعمال کرنا چاہیے۔ منحوس بھی ملبوس کے قیاس پر فارسی والوں کا تراشا ہوا ہے — ۱۲

وہ اس کے سامنے آیا زباں پرواستاں ہو کر

نکل آتے ہیں ہر اقرار میں انکار کے پہلو

بنا دیتی ہیں حیراں تیری باتیں مکریاں ہو کر

نزاکت کا یہ عالم پھول بھی توڑے تو بل کھا کر

نہ جانے دل میرا کس طرح ٹوٹا پہلواں ہو کر

نذر و وکیک پر نہیں کرا و کٹھی نحو ، اٹھکھٹرائے ہیں

سبک کرتے ہیں ان کو ناتجے بار گراں ہو کر

گلا گھونٹا ہی ضبط غم نے کچھ ایسا کہ مشکل ہے

کہ نکلے منہ سے آوازِ شکستِ دل فغاں ہو کر

نتیجہ اندیشۂ سالک نے پایا منزلِ دل کا

تو پلٹا لامکاں سے آسماں در آسماں ہو کر

ہوئی پھر دیکھئے آبستنِ شادی و غم دنیا

ابھی پیدا ہوئے تھے رنج و راحت تواماں ہو کر

جو نکلی ہو گی کوئی آرزو تو یہ بھی نکلے گا

تمہارا تیرِ حسرت بن گیا دل میں نہاں ہو کر

اوتر جائیگا تو او آفتابِ حسن کوٹھے سے

گریگا سایۂ دیوار ہم پر آسماں ہو کر

۷ — و لہ — ۸۸

وہی سمجھیں گے اس کو جو نظر رکھتے ہیں جوہر پر
کہ اب تک ہنس رہا ہے آئینہ بخت سکندر پر

خبر دیتا ہے بیتابی کی اشک خوں سر مژگاں
لہو کی بوند دیکھو اور کروٹ نوک نشتر پر

مے عرفاں کہ چھوٹی کی ہوئی ہو میرے ساقی کی
ٹپکتی ہے مری رال اُس شراب روح پرور پر

بنائی جان ایسی سخت اور دل اسقدر نازک
زہی قدرت تری پھینکا ہے کیا شیشہ کو پتھر پر

بڑھایا کیا سمجھ کر اور اس پر بار عصیاں بھی
ازل کے دن سے کچھ بار امانت کم نہ تھا سر پر

کہیں ایسا نہو نالوں سے میرے حشر ہو جائے
مرا انصاف یارب تو نے کیوں رکھا ہے محشر پر

جو اشک آنکھوں میں بھر لائے ہو آئینہ دکھا دونیں
ڈھلکنا دیکھ لو شبنم کا رخسار گل تر پر

۸ — فاعلاتن مفاعلن فعلات — ۸۹

آفریں شوق گام فرسا پر | اگر کے اٹھا ہوں ہیں ہر اک جا پر

باندھی ہے مدح شہ کی دھن میں نے
نغمۂ عندلیب شیدا پر

دے خدا اگر دل و زباں تو کرے
شکر راحت پہ صبر ایذا پر

جزر و مد میں فنا کے ہے عالم
بہہ رہا ہے یہ قصہ دریا پر

ق
آسماں پھینکتا ہے سنگ جفا
تاک کر قلب ناشکیبا پر

رقص اس گنبد زبرجد کا
ہے صدائے شکست مینا پر

کچھ سلیمان سے بھی زیادہ ہے
ناز منعم کو نقش دیبا پر

خطبہ پڑھتا ہے پیرزن کا غبار
عدل کسریٰ کا طاق کسریٰ پر

حرف ش

٩٠ — ١٤

خار حسرت کو ہے جگر کی تلاش
گل داغ جنوں کو سر کی تلاش

عشق میں تیرے ہے جہاں بیمار
چارہ گر کو ہے چارہ گر کی تلاش

اپنے دل میں خدا کو ڈھونڈھ لیا
حد سے اب بڑھ گئی بشر کی تلاش

میں دعا مانگتا ہوں محشر کی
ہے جو اک شوخ فتنہ گر کی تلاش

میکدہ کو ہمارے ڈھونڈھ لیا
گئی خالی نہ ابر تر کی تلاش

سرمۂ خوش چشم کو ہے مد نظر
فتنہ گر کو ہے فتنہ گر کی تلاش

جو رہ عشق میں ہیں وارفتہ
نہیں رکھتے وہ راہبر کی تلاش

ایڑیوں تک پہنچ کے ٹھہری زلف — مصرع قد ہے رات بھر کی تلاش
دوپہر تک تھا انتظار اوس کا — دوپہر تک رہی سحر کی تلاش
مجھ کو سکتا ہوا جو ہجر کی شب — رہی آئینہ سحر کی تلاش
غرق رہتا ہوں فکر مضموں میں — ڈوب کر چاہیے گہر کی تلاش
یاالٰہی ہو ایسا جوش بہار — رگ گل کو ہو نیشتر کی تلاش
دل جو ٹوٹا تو پھر نہیں جڑتا — کیجیے خاک شیشہ گر کی تلاش

مل گئی قبر کی جگہ اے منظم
ہو گئی ختم عمر بھر کی تلاش

۱۹ — مدح اعلیٰ حضرت قدر قدرت خلد اللہ ملکہ — ۱۰

شب قدر است زلف عنبر بیش — طلوع صبح عید است از جبینش
شہ باذل کہ حق یادش نگہبان — بہ تاج و تخت و ملک و داد و دینش
چناں آراست ملکش در زمانش — کہ مثل آسماں شد سر زمینش
معظم جاہ شد ماہ تمامش — چو اعظم جاہ شد مہر مبینش
رواں کرد ست دریا در بیاباں — کہ باشد بحر عماں در یمینش
فلک نیلی ز عکس آبگونش — زمیں سرسبز از ماء معینش
نہ ہے ایں چشمہ سار صاف شیریں — عیاں راز دل از چین جبینش
چناں کشت و چمن را کرد شاداب — کہ عذرا بر فلک شد خوشہ چینش

کنار رود موسی داو ریگاه | که موسی خاتم است و او نگینش
زہے شاہیکه در قالب دمد روح | صریر کلک معنی آفرینش

۹۲ ولہ ۱۳

طلسمے بیش بنو و لجۂ ہستی وسیلابش
که بر ہم میزند موج فنا صد نقش بر آبش
زند صد قافله پے ہم کند صد سلسله برہم
گه از ابروئے پرچینش گه از گیسوی پرتابش
دوائے درد دل باشد لب آں عیسی دوراں
که دارد طعم صد تنگ شکر اندر دو عنابش
چو اکسیر وفا خواہی شرار عشق روشن کن
دل مضطر بدست آور که بیتابیست سیمابش
رگ نخوت ہمی باشد طناب گردن ظالم
که بر خاک مذلت میکشد از فرش سنجابش
به زخم ابروے او لذت آزاردہ چنداست
که بوئے خشک می آید ازیں تیغ سیه تابش
اگر سر می نہم بر پائے نازک سرگراں گردد
وگر سر می کنم افسانهٔ غم می برد خوابش

سپہر و انقلاب پے ہم او نیست بے چیزے
کہ خون عالمے چون آب خواہد ریخت دورباش
بگورستاں سر فغفور می بینم سر خشتے
کجا شد بالش قاقم کہ بد نازش گہ خوابش
اگر برخاست روزے گردباد از آہ مظلوماں
شکست افتاد ایں نہ خرگہ نیلی و اسبابش
دریں جوش سرشک از ماجرائے دل چہ می پرسی
کہ سر بر زد حباب آسا ز بحر و برد سیلابش
عزیزے کو کہ از اسرار ہستی پردہ برگیرد
دل خلقے بجاں آمد ز یک تعبیر و صد خوابش
نباشد صورتے فارغ ز معنی اندریں عالم
چو آئینہ قدم زن در رہ دیدار معنی یابش

حرف ض

۹۴ ——— ۱۰

کچھ ابر سے اوڑتی ہوئی دی ہے خبر فیض
کانٹوں پہ ہے وہ راہ ملو آنکھوں سے ہی رستہ
آتا نہیں دریا کی روانی میں کبھی فرق

ساقی نظرِ فیض ہو ساقی نظرِ خیر
اک وادی اسراف ہے اک رہ گذر فیض
ہنستے ہیں یہ کہتی نہیں شوریدہ سر فیض

کہتے ہیں جسے چشم طلب وہ تو ہو پیدا — اک جنبش مژگاں سے کہیں لاکھ در فیض

طبع بلکم اے اہل کرم واہ ری رفعت — لے اڑتے ہیں طوبے کی طرف بال و پر فیض

ای سر سعاں دست نگر تیرے ہیں مسکیں — ہاتوں کی لکیریں ہیں کہ ہی رہگذر فیض

کیا اہل قناعت کو غرض اہل غنی سے — ہم کو سر فیض اب نہ او نہیں در سر فیض

زاہد تجھے کیا اس کی کریمی سے عجب ہے — گر توبہ کا ہو در بند تو کھل جائے در فیض

گرداب حوادث میں ہوں ای مسند فیاض — اتر جاؤں میں ہو جائے جو مجھ پر نظر فیض

مانند نگیں آنکھ جھپک جائیگی اے نظم
اوٹھ جائینگے ہم چھوڑ کے اپنا اثر فیض

حرف (ف)

۹۴ — ۱۶

پھری ہوئی مری آنکھیں ہیں تیغ زن کی طرف[1] — چلا ہے چھوڑ کے بسمل مجھے ہرن کی طرف

بنا ہو ا ہے آئینہ آپ سے تماشہ — نہ دیکھی راہ جو خلوت سے انجمن کی طرف

رہ وفا لو نہ چھوڑا او وہ عندلیب ہوں میں — چھٹا قفس سے تو پرواز کی چمن کی طرف

گریز چاہیے طول امل سے سالک کو — سنا ہے راہ یہ جاتی ہے راہزن کی طرف

سر آئی دوپہر میں سوؤ گے غافلو کب تک — اٹھو تو کیا تمہیں جانا نہیں وطن کی طرف

پھرا وہ دل میں الگ ہیں وہ اہل ظاہر سے — نہ میں ہوں شیخ کی جانب نہ برہمن کی طرف

[1] آئینہ کے ہر ٹکڑے میں پورا عکس دکھائی دیتا ہے ہر ہر ٹکڑا آئینہ بن جاتا ہے ۱۲

جہاں حادثہ آگیں ہیں نشہ کا ورود
گذر حباب کا دریا سے موجزن کیطرف

اسی امید پہ ہم دن خزاں کے کاٹتے ہیں
کبھی تو باد بہار آئیگی چمن کیطرف

بچھڑ کے تجھ سے مجھے ہے امید ملنے کی
سنا ہے روح کو آنا ہے پھر بدن کیطرف

گواہ کون ہو مرے قتل کا ہو محشر میں
ابھی سے سارا زمانہ ہے تیغ زن کیطرف

خبر وہی اٹھ کے قیامت نے اسکو آنے کی
خدا ہی خیر کرے رخ ہے انجمن کیطرف

وہ اپنے رخ کی صباحت کو آپ دیکھتے ہیں
جھکے ہوئے گل نرگس ہیں یاسمن کیطرف

تمام بزم ہے کیا ہو اوس کی بات تو میں
نظر دہن کیطرف کان ہے سخن کیطرف

اسیر ہو گیا دل گیسوؤں میں خوب ہوا
چلا تھا ڈوبنے مرنے چہ ذقن کیطرف

یہ مسکینوں کی ادا ابر بھی سیکھ گئے
گھٹا رہے جو سے جو لٹکے چلے چمن کیطرف

زہے نصیب جو ہو کربلا کی موت سے نظم
کہ اوڑھ کے خاک شفا آئے خود کفن کیطرف

۹۵ ——— (۸)

جنوں میں بید حاگیا وحشت میں بیاباں کیطرف
ہاتھ جس طرح سے آتا ہے گریباں کیطرف

اتنے بیٹھے دل غمگین کو یہ کیا لہر آئی
اونہہ کے طوفان چلا دیدہ گریاں کیطرف

دیکھنا لالۂ خودرو کا لپکنا ساقی
کوہ سے دوڑ گئی آگ بیاباں کیطرف

رو دیا دیکھ کے اکثر میں بہار شبنم
ہنس دیا دیکھ کے اکثر گل خنداں کیطرف

بات چھپتی نہیں بیٹھی ہیں نگاہیں سب کی
اوس کے دامن کی طرف [illegible] کیطرف

سیکڑوں داغ گنہ دھو گئے رحمت تیری
کیا گھٹا جھوم کے آئی تھی گلستاں کی طرف

چشم آئینہ پریشاں نظری سیکھ گئی
دیکھتا تھا یہ بت زلف پریشاں کی طرف

سر جھکائے ہوئے ہے نظم بسان خامہ
سمت سجدہ کی ہو تیری خط فرماں کی طرف

۹۶ — حرف ق — ۱۲

خاک جاں بر ہو مبتلائے فراق
لے چلی قبر میں بلائے فراق

ہے فلاطون عشق کا ارشاد
شربت مرگ ہے دوائے فراق

منہ بنانا ہی طرز نازش وصل
منہ پھرانا ہے اک ادائے فراق

شب فرقت ابھی سحر ہو گی
لب تک آئیں نہ نالہائے فراق

تھے مزے عشق کے جوانی تک
ہائے لطف وصال ہائے فراق

وصل کی تو دعا قبول نہیں
مانگنا چاہیے دعائے فراق

ہو گئی صبح رہ گیا قصہ
تھے ابھی لب پہ شکوہ ہائے فراق

تا فلک پہنچی تا اثر نہ گئی
واہ ری آہ نارسائے فراق

چشم پرخوں کا جام پر ہے یقیں
گریہ سمجھا میں خندہ ہائے فراق

کشتہ سیماب اضطراب کا ہے
دل کو حاصل ہے کیمیائے فراق

ساغر بادہ ہے دل پر خوں
شور فریاد ہے صدائے فراق

جی بچا گر تو وصل یار سے پھر
جھیلیں نے ظلم سب جفائے فراق

حرف م

۹۶

نہ پا سکے گل مقصود اس بہار سے ہم
ادھر تھی باد سیہ کے تجلّی خورشید
اثر سے روز کے ہے وہ ہمارے حسن اسیر
فنا ہوں یوں کہ ملے بعد اس کے عمر ابد
رہیں گے صورت عیسیٰ نہ راہ ہستی میں
کمند بام حقیقت تھا عشق قامت یار
خدا کے واسطے جا یار سے کہے نہ کوئی
نشان کسی کو ہے معلوم عمر رفتہ کا
مٹی نہ کاہش جاں رنج میں رہتے ہیں
ہوئی کدورت دل و رخ خاکساری سے
وہ آئی ہیں گم ایسی ہم سے بے خبری
نہ خواب میں کبھی آئی نہ تھیں [illegible]

۱۷

اٹھا کے داغ چلے باغ روزگار سے ہم
جھلک نہ دیکھ سکے پردہ غبار سے ہم
شکار کھیلتے ہیں دام آبشار سے ہم
نکالیں آب بقا ظلمت مزار سے ہم
پیادہ ہو کے نکل جائینگے سوار سے ہم
فلک پہ چڑھ گئے تسبیح کی طرح دار سے ہم
اٹھا رہے ہیں یہ جبر اپنے اختیار سے ہم
صدا یہ سنتے ہیں [illegible] غبار سے ہم
[illegible] سے ہم
اس آئینہ میں جلا [illegible] سے ہم
کہ دیکھتے ہیں [illegible] انتظار سے ہم
گئے وہ دن کہ [illegible] سے ہم

قطعہ

عدم سے دہر میں برزخ سے آئے محشر میں
رکا نہ پاؤں نہ بیٹھے کہیں قرار سے ہم

خبر یہ صور میں تھی ہو کریم کا دربار
یہ شور سن کے نکل آئے ہیں مزار سے ہم

قطعہ

نہ سمجھے یہ کہ نمائش سراب کی ہے جہاں
غضب میں پڑ گئے ہستی کے اعتبار سے ہم

غضب کا رقص فلک نے ہمیں دیا ہو گا
رہے نہ آپ میں اک جلوۂ شرار سے ہم

ہزار معرکۂ امتحان ہوئے اے نظم
کسی سے کم نہ رہے فضل کردگار سے ہم

۹۰ —————— ۱۲

جاں در ہوائے بادۂ اطہر فروختیم
دل در بہائے ساغر کوثر فروختیم

در کار سالکاں زر و زیور فروختیم
وز بہر حفظ نام و نسب سر فروختیم

تا دل بہ آں دو زلف معنبر فروختیم
خود را فروختیم و مکرر فروختیم

جاں را برائے ابروئے خود فشاندہ ایم
سر را پئے گرفتن افسر فروختیم

در ماندہ ایم زیر فلک چوں ہلال و بدر
تا تیغ آوریم بکف سر فروختیم

تا جا گرفت در دل ما خوف باز پرس
از رنگ روئے خود ورق زر فروختیم

ترکِ خجے دہی جز اشک ندامت بہانہ دا
آئینہ خانہ را بدو گوہر فروختیم

در شعر بس بخون جگر پا فشردہ ایم
تا مشک نافہ چوں گل تر فروختیم

رفتی غبار طبع بہ شیریں تبسمی
شادیم ما کہ خاک بہ شکر فروختیم

افتاد تا معامله با رحمت خدا | نامه سیاه به محشر فروختیم
رود او فاقه مستی با میکشان مپرس | دستار را به شیشه و ساغر فروختیم
وارفتگی با بخرام کسی مپرس | خود را بدست فتنه محشر فروختیم

ولہ

۹۹ —— مفتعلن فاعلات مفتعلن فا —— ۱۱

همتی از باد صبح گاه گرفتم | رفتم و از غنچه درس آه گرفتم
عزم تشی خون ترا مبارک و فرخ | فال ز بشکستن کلاه گرفتم
دل بغم تو نداشت تاب صبوری | اشک سراسیمه را گواه گرفتم
منفعلم از وفا بعرصه محشر | دامن یوسف باشتباه گرفتم
مستی من از شراب گردش چشمیست | باده به پیمانه نگاه گرفتم
خار غم از بسکه داشت تشنه لبیها | خون دل از نبض بر آه گرفتم
باطن من شد ز شرم ظاهر من آب | نکته چو بر آب زیر کاه گرفتم
از قدمم گرد باد تارگ ابر است | من ز بیابان سراغ چاه گرفتم
خاک بچشم فشاند و قافله بگذشت | سرمه عبرت ز گرد راه گرفتم
قفس ستمگار را بکشم و آنگه | دست و گریبان عذر خواه گرفتم

شعر اسیر است نظم شمع ره ما
آتش از آن گرمی نگاه گرفتم

حرف ن

۱۰۰ ——— مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن ——— ۲۰

مزہ بیاں میں نہیں اب اثر فغاں میں نہیں
بہار میں جو طبیعت تھی وہ خزاں میں نہیں

جو چل بسے کہیں انکا پتہ جہاں میں نہیں
نشان نقش قدم کا رفتگاں میں نہیں

خوشی خوشی شب عشرت کسی میں کٹتا ہوں
کہ ایسی رات کوئی عمر جاوداں میں نہیں

یہ دیکھنا گل و بلبل کی کیا بن آئی ہے
اب اتفاق جو صیاد و باغباں میں نہیں

مجھی پہ حوصلے نکلیں گے آج قاتل کے
مری سوا کوئی میدان امتحاں میں نہیں

چلی نہ چشم فسوں گر سے کچھ فسوں سازی
وہ سحر کونسا ہے جو مری بیاں میں نہیں

وہ سوکے اٹھتے ہیں کسکو مجال عرض نیاز
مزاج پوچھیے یہ جرات عز اجلانمیں نہیں

یہ چبھو ڈالی ہے میرے دلمیں انی ناصح
مجھے عجب ہے کہ چھالا تری زباں میں نہیں

وہاں خمار تغافل سے سرگرانی ہے
یہاں شراب اثر شیشۂ فغاں میں نہیں

دیا مجھے تری نیم نگہوں نے اک غم عشق
وہ داغ جو پر طاؤس آسماں میں نہیں

مرا لہو شب غم نے پیا تو چین آیا
کہ آج صورت خمیازہ کہکشاں میں نہیں

کشش جو دل میں ہے میری سر رشتہ آہ میں ہے
وہ کہربا میں نہیں ہے یہ کہکشاں میں نہیں

فلک کو رشک ہوا اس کی طرز دامن پر
ستارے ایسے یہ تحریر کہکشاں میں نہیں

جگر میں عشق کا ہے داغ رخ پہ اسکی چمک
فروغ ماہ نہاں پردہ کتاں میں نہیں

وہ کاش سائل دیدار کو جلا دیتا
کوئی شرار ترے سنگ آستاں میں نہیں

ہے ایک قافلہ ریگ رواں و عمر رواں
متاع درد و محبت جو کارواں میں نہیں

رہی گی کشتیٔ تن غرق ہو کے خشکی میں
جو خاک لائیں کشش ہو وہ بادباں میں نہیں

بزور ہمت مردانہ توڑ ہفت حصار
کہ راہ بند ہی رستم جو ہفت خواں میں نہیں

جو طبع رمز شناس و کنایہ فہم نہ ہو
تو کچھ مزہ گل و بلبل کی داستاں میں نہیں

برا نہ مان جو پہنچے کسی سے رنج ای نظم
کہ ہوشیار کوئی دور آسماں میں نہیں

۱۵ ——— ۱۰۱

حریف تم نہیں دوستدار بھی تو نہیں
وہ آنکھ اب نہیں وہ چاہ و پیار بھی تو نہیں

مرا لہو ہے زاہد جو پی نہ لے یہ جام
کہ دن ہے عید کا تو روزہ دار بھی تو نہیں

چمک تجھ میں ہے کچھ ایسی کہ ابر و برق ہو مات
ہوا کے گھوڑے پہ ظالم سوار بھی تو نہیں

نہیں ہیں مستیٔ ناپائیدار کا قائل
کہ مستعار کہوں مستعار بھی تو نہیں

اٹھاؤں ظلم میں کس کس کا تو فلک میں خم
کہ دل تو ایک ہے دو تین چار بھی تو نہیں

ہے ایک تار مرے جسم زار کو کافی
مگر کفن کے لیے ایک تار بھی تو نہیں

لہو کا ماتم کے کس طرح سے [illegible]
جنوں میں ایک جگہ پر قرار بھی تو نہیں

دل و جگر پہ تیغ نگاہ سے تو [illegible]
[illegible] آنکھ چار بھی تو نہیں

نہ دل لگا کے کبھی درد دل شناسیہ
[illegible] بھی تو نہیں

یہ ہاتھ دوڑ رہا ہے عبث گریباں پر — کہ تار تار یہ ہے کچھ سنار بھی تو نہیں

اگر یہ حشر میں مجھ سے حساب کیا ہوگا — کہ بے حساب گنہ ہیں شمار بھی تو نہیں

کہا کہ درد جگر پھر کہو میں کہتا ہوں — ستم یہ ہے کہ تمہیں اعتبار بھی تو نہیں

کسی گڑھے میں گرا دے نہ تجھکو توسن عمر — وہ تیز گام ہے تو شہسوار بھی تو نہیں

اوڑانے آئے تھے ہم خاک کوئے قاتل میں — بدن پہ سر نہیں سر پہ غبار بھی تو نہیں

یہ سچ ہے نظمؔ ہے دیوانگی میں رسوائی
جہاں میں ایسا کوئی پردہ دار بھی تو نہیں

۲۵ ——— ۱۰۲

تو ایک آہ میں اے چرخ کج مدار نہیں — جو خاک میں نہ ملا دوں تو خاکسار نہیں

کسی سے ہمکو امید کشود کار نہیں — مجھے اجل کے بھی آنیکا اعتبار نہیں

تجھکوں جو اہل تجمل سے خلحسار نہیں — فلک سے دب کے رہی جو وہ غبار نہیں

فقیر خانہ میں اہل ہوس کو بار نہیں — کہ شمع بھی مری محفل میں تاجدار نہیں

پھر اور کیا ہے یہ عالم جو رہگزار نہیں — کہ ہستی گذراں کا کچھ اعتبار نہیں

ہستی کے گزران ہونے سے معلوم ہوا ہے کہ عالم رہگذار ہے

نہ آن بان طبیعت میں ہو تو انساں کیا — کہ جسمیں بل نہو رسی وہ استوار نہیں

سنبھالے کون کسی کو لے کسی کی خبر — تمام بزم میں کوئی بھی ہوشیار نہیں

یہ مجھ سے زیست کا نقشہ بگڑ کے کہتا ہے — مزاج یار ہوں کچھ میرا اعتبار نہیں

کسی کے خون کا پیاسا ضرور ہے صیاد
جواب نامہ کا قاصد مزار پر ... لایا
یہ کہہ کے اٹھ گئی بالیں سے میری شمع سحر
زمین تخت فلک دور ہے بشر مجبور
قریب تر رگ گردن سے پھر بھی اتنا دور
کسی کے جلوہ کو اس مشت خس سے کیا نسبت
جو وہ ہو پاس تو حور و قصور سب کچھ ہو
چلے جو خاک شہیداں پہ اس گلی کی ہوا
کھڑے ہیں دام بچھائے ادھر ادھر صیاد
گذرتے ہیں نفس مستعار مثل نسیم
عدم کا قافلہ کیا جانے کس طرف کو گیا
اوسی سے کہہ تیری کہنی یہ جو چلے ناصح
خزاں کے آنے سے پہلے ہی تھا مجھے معلوم
فلک ہے وہ ستم کینہ ور خدا کی پناہ
لگی یہ چشمہ حیواں کی تہ میں غلط رسم
مقرر ہے دل میں تو دشمن زباں سے گو ہیں ہی
غزل کہی ہے کہ موتی پروئے ہیں اے نظم

کماں میں تیر ہے تو فتراک میں شکار نہیں
کہ جاتا تھا اسے تاب انتظار نہیں
تمام ہو گئی شب اور تجھے قرار نہیں
فرو ہے جان بھی دینے پہ اختیار نہیں
نظر کے سامنے وہ پھر بھی آشکار نہیں
وہ صاعقہ نہیں شعلہ نہیں شرار نہیں
جو وہ نہیں تو نہیں بلکہ یہ بہار نہیں
چراغ لیکر بھی ڈھونڈو تو پھر مزار نہیں
نہ کھا فریب یہاں نخل سایہ دار نہیں
کسی کو خار نہیں ہیں کسی پہ بار نہیں
ذرہ بھی گرد نہیں راہ میں غبار نہیں
ہیں ہرزہ گرد نہیں سیل رہ نہیں ہرزہ کار نہیں
کہ رنگ و بوئے چمن کا کچھ اعتبار نہیں
عقال پاؤں میں جسکے نہیں مہار نہیں
کوئی زمیں نہیں ایسی جہاں مزار نہیں
جو چوٹ کھا کے نکل جائے کیا شکار نہیں
وہ کون شعر ہے جو در شاہوار نہیں

نہ اہل دل سے نہ اہل نظر سے پوچھتا ہوں
خبر وہاں کی ہر اک بے خبر سے پوچھتا ہوں

وفور شوق میں کھویا گیا ہوں کچھ ایسا
کہ نامہ لکھ کے پتہ نامہ بر سے پوچھتا ہوں

بتا یہ خواب کا عالم ہے یا ہے بیداری
یہ اپنی چشم حقیقت نگر سے پوچھتا ہوں

کوئی خبر نہیں دیتا ہے خاک جسم کی مجھے
میں خشت گر سے کبھی کوزہ گر سے پوچھتا ہوں

میں وہ ہوں گرد پس کارواں تھکا دم
کہ رہروؤں کا نشاں رہ گذر سے پوچھتا ہوں

اسی طرح مری آغوش سے اٹھا تھا کوئی
تڑپ تڑپ کے یہ درد جگر سے پوچھتا ہوں

عبث ہی خضر اگر ساتھ ہو لئے میرے
کہیں میں اس کا پتہ راہ بر سے پوچھتا ہوں

کرشمہ اس کی نگہ کے کسی سے کیوں پوچھوں
یہ اپنے دل سے یہ اپنی جگر سے پوچھتا ہوں

ملا نہ نقش قدم ہی تو رہروؤں کا پتہ
میں اب غبار سر رہ گذر سے پوچھتا ہوں

بھرا ہے جام صبوحی کا شاخ گل کی طرح
پتہ چمن کا نسیم سحر سے پوچھتا ہوں

شجر ہیں وجد میں کیوں گل ہیں کس لئے بیخود
یہ حال بلبل شوریدہ سر سے پوچھتا ہوں

ہنوز سر حقیقت کا ذوق باقی ہے
جواب کچھ نہ ملا عمر بھر سے پوچھتا ہوں

جگر تھا سپر ابھی کیا ناوک ستم کے لئے
میں آج قاتل بیداد گر سے پوچھتا ہوں

بتا تو عشق کا انجام ہوگا کیا اے نظم
مآل کار کو میں پیشتر سے پوچھتا ہوں

جو دل کو ہنس کے چھپکیں تو آرزو نہ کریں
جو پاؤں کاٹ کے بیٹھیں تو جستجو نہ کریں

وہ جا کے باغ میں غنچہ کا دل لہو نہ کریں
شہید سرو چمن کو کنار جو نہ کریں

نکالیں تیغ کہ یک سو ہو روز کا جھگڑا
رقیب مجھ سے لگی لپٹی گفتگو نہ کریں

وہ اشک کیسے پھپھولے نہ جن سے پڑ جائیں
وہ داغ کیسے کلیجہ کو جو لہو نہ کریں

کہیں ہزار میں حق ہم وہ تیغ عریاں ہیں
کسی کا منہ نہ کریں پاس آبرو نہ کریں

جناب شیخ کے زہد و ورع کو دیکھ لیا
کٹیں یہ ہاتھ جو اب بیعت سبو نہ کریں

گلہ نہ شکوہ کہ وہ لب سے لب ملائے ہیں
دہن پہ مہر یہ کی ہے کہ گفتگو نہ کریں

قسم یہ دیجے میں کہتا ہوں آرزوؤں سے
مرا لہو پئیں دل اگر لہو نہ کریں

حریف نکلے نہ چھریاں لگائیں بس مجھکو
شراب حلق سے اترے ہوئی لہو نہ کریں

وہی ہے سامنے مڑ کر جدھر جدھر دیکھو
وفور شوق میں کیوں سجدہ چار سو نہ کریں

مرا غبار یہ اٹھ اٹھ کے کہتا ہے سر راہ
کہ پاؤں چلتے ہوں اور تیری جستجو نہ کریں

گناہ گار کو آتی ہے منہ دکھاتے شرم
ہماری لاش کو احباب قبلہ رو نہ کریں

وہ پاک عاشق شوریدہ سر ہوں کہ کبھی
حسین جہاں کے مرا ذکر بے وضو نہ کریں

جو دل پہ رکھیں تو رکھیں نہ دلمیں کوئی ہوس
جو دل کریں تو کسی شے کی آرزو نہ کریں

جہاں کو رہ گذر عاریت اگر سمجھیں
مقام پھر کوئی دم منزل آب جو نہ کریں

ملا ہی یہ گل صد برگ سے سبق ہم کو
ہزار بھی ہوں زبانیں تو گفتگو نہ کریں

نماز میں نہیں قتل نفس ہو منظور
تو آستین الٹ کر کبھی وضو نہ کریں

نکل گیا کسی صحرا میں نظمؔ آخر کار
جو یوں گیا اسے جانے دیں جستجو نہ کریں

۱۰۵ —— فاعیل فاعلات م فاعیل فاعلات —— ۲۰

چھٹکی ہے چاندنی سے دل پاکباز میں
ہے داغ سجدہ چاند جبین نیاز میں

آئی تھی بوئے ناز جو عرض نیاز میں
خاموش مثل شمع ہوں سوز و گداز میں

کچھ مجھ کو یہ خیال بھی ہے مشق ناز میں
پامال ہو گیا کوئی اس ترک تاز میں

جو شوخیاں ہیں خامہ افسوں طراز میں
وہ خوبیاں نہیں ہیں بتان طراز میں

ڈھیلے پڑے ہیں بند قبا خواب ناز میں
نقد وصال ہے گرہ نیم باز میں

نیچی نظر ہے شرم کی اونچی ہے قہر کی
بچتا نہیں شکار نشیب و فراز میں

دل لیکے بھول جانیکی عادت ہے آپ کو
اب کے گرہ لگائیے زلف دراز میں

دل میرا اس طرف ہے اُدھر دل رقیب کا
دونوں کو تو لیے نظر امتیاز میں

بے پردہ ہو گیا ہے تجلی سے حسن یار
ہے طاقت نگاہ کسی دیدہ باز میں

تیری زباں سے آگ لگی شمع انجمن
میری زباں کو دخل نہیں میری راز میں

تقدیر کے لکھے کو نہ ہرگز برا سمجھ
لغزش محال ہے قلم کارساز میں

پردہ میں نغمہ زن ہے تو دہوکا ہی رہ گیا
ہے جسم میں یہ روح کہ آہنگ ساز میں

کہتی تھی آج شمع سحر مجھ کو دیکھ کر
جیتے ہو کس طرح سے غم جانگداز میں

پھانسی لگا رہی ہے اجل کیا بری طرح
الجھا کے رشتہ ہائے امید دراز میں

ہوں میں تو ناتواں مجھے کیونکر نہ خوف ہو
پھنستے ہیں شیر دام گرہ حرص و آز میں

خالی نہیں فریب سے عیش اس جہان کا
ساغر شراب کا ہے کف شیشہ باز میں

اس بحر پر خطر میں ہے نیس جس کی موج
ڈر کر ہوا سوار تلاطم جہاز میں

وہ صید پر شکستہ ہوں پائی ہے پرورش
میں نے ہوائے بال و پر شاہباز میں

تسبیح اوسنے بعد پڑھی بھی تو کیا حصول
سو مرتبہ خدا کو جو بھولا نماز میں

تھا طاعت خدا میں بھی یہ حال ناظم کا
تصویر ایک کی رہی جا نماز میں

۱۵ ۱۰۶

سرمہ قضا ہے عشوہ سحر آفریں نہیں
جادو کی ہے ہوں نگہ شرمگیں نہیں

وہ دن ہے کونسا کہ میں اندوہگیں نہیں
ہر دل تو ہے کہ پاس یہ آفت کہیں نہیں

رکھتے کہیں ہو پاؤں تو پڑتا کہیں ہے پا
سنبھلو زمیں ہے یہ فلک ہفتمیں نہیں

چنبیر کیطرح رنگ بدلتا ہے آسماں
کیونکر کہوں کہ نالۂ دل آتشیں نہیں

او تنگدل یہ ہاتھ خزانہ کا سانپ ہے
افعی کی کینچلی ہے تیری آستیں نہیں

سر میں بھرا ہوا ہے تیرے بادۂ غرور
موج شراب ناز ہے چین جبیں نہیں

سر سبز کر دیا ہے سخن گو غزال کو
کم سامری سے غمزۂ سحر آفریں نہیں

پینے میں خون دل کے حلاوت کچھ ایسی ہے
حیراں ہوں شکر نہیں انگبیں نہیں

جنت میں لطف کوچۂ دلدار کا سہی
لیکن وہاں مزار کے قابل زمیں نہیں

کہتا ہے حال قبر کا دوزخ کا خلد کا
واعظ کے سر پہ تو کہیں روح الامیں نہیں

مجھ سا گناہ گار سزا اور لطف ہو
جنت بھی مل چکی مگر اب تک یقیں نہیں

آئے اگر کے تو اڑاؤں گا خاک میں
یا آج آسماں نہیں یا زمیں نہیں

جھپکے جو آنکھ سحر کی شب میں تو کس طرح
اوجھل ذرا نگاہ سے وہ مہ جبیں نہیں

دوزخ میں میں بلک کے پکاروں کہ یا کریم
آئے نہ تجھکو رحم یہ ہرگز یقیں نہیں

اے نظم کون حسن پرستی سے چھوٹ رہا
قرآن اٹھائیے شیخ تو ہم کو یقیں نہیں

۱۰۷ —— —— ۱۳

کیا ہو یقیں ملیگا وہ ہم کو یہاں کہیں
اپنا ہی اس جہاں میں پتا یا نشاں کہیں

مژگانِ تر سے چھپکے چلے اے امیرِ سحاب
ڈرتا ہوں اڑ نہ جائیں تری دھجیاں کہیں

یارب وہ تیرگی شبِ غم کی ہوئی نمود
بن جائے یہ سمٹ کے نہ سیل رواں کہیں

سمجھے تھے ہم کہ سجدۂ طاعت ادا کیا
دیکھا تو سر کہیں ہے ترا آستاں کہیں

گنبد میں آسماں کے چھپا تھا قضا سے میں
کیا جانتا تھا یہ نہ ملے گی اماں کہیں

باتیں بنا بنا کے وہ مکرے تو کیا عجب
جس نے کہ ایک بات میں سو مکریاں کہیں

وقتِ عزیز شیشہ سے نازک ہی ڈر یہ ہے
پتھر کی سل بنے نہ یہ خوابِ گراں کہیں

کیا سر کے بل گئے ہیں عدم کی سفر میں لوگ
اس راہ میں قدم کا نہ پایا نشاں کہیں

آواز ایک کی نہیں جا سکتی ایک تک
نالاں ہیں یہ نہیں ہیں جرس کارواں کہیں

لے چل مجھے بھی اے شبِ عشرت تو اپنے ساتھ
ڈرتا ہوں میں قصاص نہ لے آسماں کہیں

دل اس طرح ہوائے محبت میں جل گیا
بھڑکی ہے جیسے آگ نہ اٹھا دھواں کہیں

عالم یہ تحیر میں ہے کہ بیٹھے کہیں ہیں ہم
دل ہے کہیں خیال کہیں ہے گماں کہیں

اے نظم سانپ کاٹ کو پلٹے تو کیا ہے غم
ہاں دیکھنا پلٹ کے نہ کاٹے زبان کہیں

۱۰۸ —— ۱۵ ہیں

تیور قدم قدم پہ تجھے آئے جاتے ہیں
اور دل کے ولولے ہیں کہ دو گز بڑھے جاتے ہیں

ضحاک روزگار بنا کاکلو نے تو
دو سانپ ہیں کہ دوش پہ بل کھائے جاتے ہیں

کیا پھڑپھڑا رہا ہے دل زار شوق سے
وہ مرغ نامہ بر کو جو پر کاٹے جاتے ہیں

آہ آسماں پہاڑ کے چٹکی لگاتی ہے
ملے فراز عرش کو پچھاڑے جاتے ہیں

گویا کہ آگیا ہے ستاروں میں آفتاب
جتنے حسین ہیں سب پہ وہی چھائے جاتے ہیں

دیوانہ میں ہوں اب کہ ہیں ناصح کوئی بتائے
سمجھیں نہ سمجھیں کوئی وہ سمجھائے جاتے ہیں

آنکھوں میں ہے تری رہتی وہ دل میں سمائے
ماہی جگر تو پاؤں کو پھیلائے جاتے ہیں

بندہ تو اس ادا کا ہیں اہل کرم کی ہوں
دینے میں اور آپ ہی شرمائے جاتے ہیں

اٹھا اٹھا دیکھنی ترے بام بلند کو
چکر فلک کو آج تلک آئے جاتے ہیں

جھولا کریں مسیح ہنڈولے میں چرخ کے
ہم دور ہی سے دیکھ کے گھبرائے جاتے ہیں

مجھ سے سوال کر کے نکیرین دنگ ہیں
حاضر جوابیوں سے وہ گھبرائے جاتے ہیں

باریک ہے جو بال سے در پیش ہے وہ راہ
اور پاؤں مارے خوف کے تھرائے جاتے ہیں

باندھے ہوئے کمر پہ ٹھہرنے کی جا نہیں
ہم چلتے چلتے بات یہ سمجھائے جاتے ہیں

سب قافلہ تو جا بھی چکا نظم اب تو چونک
ایسے میں کچھ نشان قدم پائے جاتے ہیں

مفعول فاعلاتن دو بار

اس واسطے عدم کی منزل کو ڈھونڈتے ہیں
مدت سے دوستوں کی محفل کو ڈھونڈتے ہیں

پہلو کے پار ہو کر پھر دل کو ڈھونڈتے ہیں
تیر نگاہ اس کے بسمل کو ڈھونڈتے ہیں

اک لہر میں نہ سمجھے ہم کیوں اے حباب دیکھا
یوں آنکھ بند کر کے ساحل کو ڈھونڈتے ہیں

طرز کرم کی شاہد ہیں میوہ دار شاخیں
اس طرح سر جھکا کر سائل کو ڈھونڈتے ہیں

ہے وصل ہجر اپنا اے قیس طرفہ مضموں
محمل میں بیٹھے ہیں اور محمل کو ڈھونڈتے ہیں

طول امل کا رستہ ممکن نہیں کہ طے ہو
منزل پہ بھی پہنچ کر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

حسرت شباب کی ہے ایام شیب میں بھی
معدوم کی ہوس ہے زائل کو ڈھونڈتے ہیں

اٹھتے ہیں ولولے کچھ ہر بار درد بنکر
کیا جانیے جگر کو یا دل کو ڈھونڈتے ہیں

زخم جگر کا میرے ہے رشک دوستوں کو
مرتا ہوں میں کہ یہ کیوں قاتل کو ڈھونڈتے ہیں

اہل ہوس کی کشتی یک بام و دو ہوا ہے
دریائے عشق میں بھی ساحل کو ڈھونڈتے ہیں

آیا جو رحم مجھ پر اس میں بھی چال ہے کچھ
سینہ پہ ہاتھ رکھ کر اب دل کو ڈھونڈتے ہیں

کرتے ہیں کار فرہاد آساں زمیں میں بھی
مشکل پسند ہیں ہم مشکل کو ڈھونڈتے ہیں

اے خضر پے خجستہ بہر خدا کرم کر
بھٹکے ہوئے مسافر منزل کو ڈھونڈتے ہیں

دل خواہ تیرے عشوے دل جو ترے اشارے
وہ دل ٹٹولتے ہیں یہ دل کو ڈھونڈتے ہیں

اے نظم کیا بتائیں حج و طواف اپنا
کعبہ میں بھی کسی کی محمل کو ڈھونڈتے ہیں

۱۱۰ — ۲۰

کیا کارواں ہستی گذرا روا روی میں
فردا کو میں نے دیکھا گرد و غبار دی میں
تھے محو لالہ و گل کس کیف بیخودی میں
زخم جگر کے ٹانکے ٹوٹے ہنسی ہنسی میں
یاران بزم عشرت ڈھونڈوں کہاں میں تم کو
تاروں کی چھاؤں میں یا پچھلے کی چاندنی میں
ہر عقدہ میں جہاں کے پوشیدہ ہے کشائش
ہے موج خندۂ گل پنہاں کلی کلی میں
زخموں میں خود چمک ہے اور اس پہ یہ ستم ہے
رنگ پریدہ سے میں رہتا ہوں چاندنی میں
ہم کس شمار میں تھے پرسش جو ہم سے ہوتی
یہ اعتنا نہ پایا آشوب آگہی میں
حکم قضا ہو جیسا سرزد ہو فعل ویسا
بندہ کا دخل بھی ہے پھر اس کی بدی میں
رفتار سایہ کو ہے پست و بلند یکساں
ٹھوکر کبھی نہ کھائے راہ فروتنی میں
وجد آ گیا فلک کو غش آ گیا زمیں کو

دو طرح کے اثر تھے اک صوت سرمدی میں
تعبیر اس کی شاید اک واپسیں نفس ہو
جو خواب دیکھتے تھے ہم ساری زندگی میں
لائی حباب تک کو سیل فنا بہا کر
اک آہ کھینچنے کو اک دم کی زندگی میں
محشر کی آفتوں کا دھڑکا نہیں رہا اب
سو حشر میں نے دیکھے دو دن کی زندگی میں
پہلو میں تو ہوا اے دل پھر حسرتیں ہزاروں
کس بات کی کمی ہے تیری سلامتی میں
پرسان حال وہ ہو اور سامنے بلا کر
کیا جانیے زباں سے کیا نکلے بیخودی میں
تو ایک ظل ہستی پھر کیسی خود پرستی
سایہ کی پرورش ہے دامان بیخودی میں
حائل بس اک نفس ہے محشر میں اور ہم میں
پردہ حباب کا ہے فردا میں اور دی میں
آنکھیں دکھا رہی ہے دن سے مجھے شب غم
آثار تیرگی کے ہیں دن کی روشنی میں

تو نے تو اپنے در سے مجھ کو اٹھا دیا ہے
پر چھائیں پھر رہی ہے میری اسی گلی میں
سجدہ کا حکم مجھ کو تو نے تو اب دیا ہے
پہلے ہی لکھ چکا ہوں میں خط بندگی میں
اے نظم چھیڑ کر ہم تجھ کو ہوئے پشیماں
کیا جانتے تجھے ظالم رو دیگا دل لگی میں

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

۱۱۱

صبح غم کی یہ شعاعیں نشتر سے کم نہیں
چاک داماں سحر چاک جگر سے کم نہیں
حسن کی ترکیب دیتی ہے گلستاں کا جواب
قد شجر سے کم نہیں اعضا ثمر سے کم نہیں
زلف کا چہرہ پہ آنا ہے ستم ہنگام دید
ایک لمحہ بھی مجھکو رات بھر سے کم نہیں
جھک گیا ہوں ضعف سے گردش تیری قسمت کی ہے
پاوں کا چکر مرا دستار سر سے کم نہیں
میری از خود رفتگی بے روئے کم ہوتی نہیں
آپ میں آنا بھی دریا کے سفر سے کم نہیں

سجدہ کرتا تھا وہاں میں سر پٹکتا ہوں یہاں
آستانِ یار بھی کعبے کے در سے کم نہیں

کیا بتاؤں بادیہ پیما ہوں میں کس راہ میں
پاؤں میں جو آبلہ ہے وہ گہر سے کم نہیں

دل پہ بل کھانا ستم کا ہے بلا کا پیچ و تاب
بال بال اس زلف کا موئے کمر سے کم نہیں

اس میں رہتا ہے کسی کے روئے روشن کا خیال
خانۂ دل اپنا آئینہ کے گھر سے کم نہیں

انتہا رکھتا نہیں ہے گوشب فرقت کا طول
لیکن اپنا رنگ اڑ جانا سحر سے کم نہیں

منہ پہ منہ رکھ کر جو رویا پہنچے گوشِ یار تک
نظمؔ اپنا ایک ایک آنسو گہر سے کم نہیں

۲۵ ۱۱۲

یاس و امید اس طرح ہے خاطرِ دلگیر میں
ہو اندھیرا اور اجالا جس طرح تصویر میں

دم بھی لے سکتا نہ انساں گردشِ تقدیر میں
گر کشش ہوتی نہ اتنی خاک دامن گیر میں

بازہ پیدا اُنکے سرمے کی شمشیر میں
دیکھیئے پلکوں کی صف نے پر لگائے تیر میں
دم نہیں ہے صید گاہ حسن کے نخچیر میں
آرزوئیں دل میں ہیں دل ہے کسی کے تیر میں
ہو چکے ہیں خاک دونوں ہے ہوا چلنے کی دیر
صلح ہو جائیگی اب دارا و عالمگیر میں
عشق سکھلاتا جو یک روح و دو قالب کا عمل
جان اپنی ڈال دیتے ہم تری تصویر میں
صید کے دھوکے میں کیا جانے کیا تھا کس کو قتل
ڈال دیں قاتل نے باہنیں گردن نخچیر میں
ابروؤں میں تیرے ظالم اور کماں میں فرق ہے
کام ہوا تیکے اشارہ میں تو اس کے تیر میں
رات کو تارے کھلے تھے صبح کو کلیاں کھلیں
واشد خاطر نہ تھی اک میری ہی تقدیر میں
وصف تیرا ایک سے بھی ہو نہیں سکتا بیاں
ہے زباں تقریر میں عاجز قلم تحریر میں
خرمن صبر و سکوں کی یا الٰہی خیر ہو

آج بجلی کی چمک ہی آہ بے تاثیر میں

کعبہ و بت خانہ عارف کی نظر سے دیکھیے
خواب دونوں ایک ہی ہیں فرق ہی تعبیر میں

اس کی ایک ایک بات کو دیتا ہوں میں شوخی جواب
طول موسیٰ نے دیا تھا جس طرح تقریر میں

آپ سے ہو کر مخاطب محو ایسا ہو گیا
عرض مطلب کو میں بھولا لذت تقریر میں

میں اگر زنداں سے اٹھا جان لے محشر اٹھا
اے جنوں شور قیامت ہے میری زنجیر میں

کہکشاں کے حلقہ حلقہ سے یہ مضموں ہے عیاں
باندھ کر رکھا ہے فیل مست کو زنجیر میں

جس قدر تڑپا اسیری اس قدر بڑھتی گئی
طوق آخر کو الجھ کر رہ گیا زنجیر میں

سر جو ٹکرایا تو دیواروں کو رنگیں کر دیا
ایڑیاں رگڑیں تو ..... صیقل ہو گئی زنجیر میں

کم نہیں رخت عروسی سے محرم کا لباس
لاکھ زیور کا مزہ ہلکی سی اک زنجیر میں

لعل پڑے گیسو تو بند ہنا اک مصیبت ہوگیا
زلف ہیکل میں کبھی او کبھی کبھی زنجیر میں

زلف کے سودے میں آیا اوسکی آنکھوں کا خیال
اور دو حلقے زیادہ ہوگئے زنجیر میں

ہو رہی ہے قصر تن کی مہر و مہ سے پرورش
اوٹھ رہی ہیں درہم و دینار اس تعمیر میں

بڑھکے کاجل سے بھی کچھ کاجل کا لگنا ہے ستم
سرمگیں آنسو لگا دیتا ہے پیکاں تیر میں

اس نے دیکھا جب لگا کر دانت پر تلوار کو
آب گوہر مل گئی آب دم شمشیر میں

تجھ سے ہم کہتے تھے اے نظم منہ سے اُف نکر
ہو گیا کفران نعمت شکوہ تقدیر میں

۲۲ — ۱۱۳

درد دل سے عشق کے بے پردگی ہوتی نہیں
اک چمک اوٹھتی ہے لیکن روشنی ہوتی نہیں

آئینہ دار خیال یار ہے جوش سرشک
کون سا شیشہ ہے وہ جس میں پری ہوتی نہیں

سو کے او ٹھنے کا ترے کچھ اور ہی انداز ہے
اس طرح خورشید کی تیوری چڑھی ہوتی نہیں

جلنے والے جل کے رہ جاتے ہیں کیسا دیکھکر
صبح کو ہونٹوں پہ جب شب کی مسی ہوتی نہیں

کیا کہوں میں توڑتا شیشے سے ٹکرا کر اوسے
تو یہ زاہد بوقت میکشی ہوتی نہیں

وصل کی شب وا ہے میرا اور کسی کی کروٹیں
دیکھوں تو پامال حسرت کونسی ہوتی نہیں

شکوۂ بیداد پر کیا ہو تلافی کی امید
ناز ہوتا ہے اوسے شرمندگی ہوتی نہیں

آنکھ بھر کر دیکھنے سے اوس کے جو ہوتا ہے حال
ساغر سرشار سے یہ بیخودی ہوتی نہیں

دیدہ حیراں کے آگے ہوتی ہیں جو شوخیاں
محرم اس ناز و ادا سے آرسی ہوتی نہیں

ہے شب غم میں زمانہ میری نظروں میں سیاہ
کہہ رہا ہوں آج اب تک روشنی ہوتی نہیں

گوشۂ عزلت ہے جز رو مد عالم سے الگ

غم یہاں مرنے کا جینے کی خوشی ہوتی نہیں

یہ مرضِ ہستی کا اے خضر اور اے رہبر تم

پی گئے آبِ بقا اب زندگی ہوتی نہیں

دل اٹھا لینے میں دنیا سے وہ ملتا ہے سکوں

اہلِ دل کو اس سے بہتر دل لگی ہوتی نہیں

دولتِ کونین ملتی ہے جو طالب ہوں ابھی

اپنی ہمت ہے کہ اب تک ملتجی ہوتی نہیں

شبنم و گل برق و باراں جام و مینا کا ہے ساتھ

کس کے رونے پر زمانے میں ہنسی ہوتی نہیں

دل کے ابنائے زمانہ سے ملے کیا مجھ کو لطف

دوستی نبھتی نہیں ہے دشمنی ہوتی نہیں

آسیائے چرخ ہے مدت سے اور عظمِ رمیم

قسمتِ اجزا ابھی تک منتہی ہوتی نہیں

سیدھی سادی راہ کوئی بیکسی کی راہ ہے

بیچ میں دیوار گر دنا کسی ہوتی نہیں

آئینہ کی طرح سب سے دل کو میں رکھتا ہوں صاف

خوب ہو یا زشت مجھ سے بیرخی ہوتی نہیں

غیر ممکن ہے کہ یک دل یک زباں ہو ساری خلق
جب کہ دو شخصوں کی صورت ایک سی ہوتی نہیں

پڑ گیا ہے پھیر کنہ معرفت کی راہ میں
دوڑتے سب ہیں رسائی ایک کی ہوتی نہیں

اس زمیں میں اور کچھ اشعار رندانہ سنا
نظم اہل ذوق کو سیری ابھی ہوتی نہیں

۱۱۴ ۱۲

دل نہ ہوتا گر تو پھر کچھ دل لگی ہوتی نہیں
غم کبھی ہوتا نہیں حسرت کبھی ہوتی نہیں

لوٹتے رہتے ہیں تجھ پر جلنے والوں کے دل
ورنہ یوں پوشاک تیری ملگجی ہوتی نہیں

دور ہیں فصل خزاں کے آشیاں سے کیا غرض
پھونک دیتے ہم اگر بجلی گری ہوتی نہیں

کاتبان نامۂ اعمال نے دھروا دیا
ہم بچا جاتے اگر لکھا پڑھی ہوتی نہیں

دل رہین عشق ہو کر مال ان کا ہو گیا
بیچ لیتے ہم اگر آئی گئی ہوتی نہیں

ہجر کی تاریک راتیں تھیں جو قسمت میں مری
کاشکے یہ چار دن کی چاندنی ہوتی نہیں

خون پی کر غم نہ کر دیتا اگر صید زبوں
اے اجل تجھ سے مجھے شرمندگی ہوتی نہیں

در کھلے ہیں آسماں کے مے پرستوں کے لئے
ورنہ یوں تکلیف از خود رفتگی ہوتی نہیں

ہو گیا زنگ تعلق مانع سیر و سلوک
دوڑتے گر پاؤں میں مہندی لگی ہوتی نہیں

پھر اگر بیجا خزاں سی جھک کے ہم کرتے سلام
سروِ گلشن میں جو اتنی راستی ہوتی نہیں

ملنے والا تھا دل حسرت زدہ جس دن مجھے
کاش عالم میں وہ ساعت وہ گھڑی ہوتی نہیں

نظم جب تک ہو سکے ترک تشخص چاہیے
ہم خدا تجھ کو سمجھتے گر خودی ہوتی نہیں

۱۱۵ ولہ ۹

حرص را خون کردن و دل را تونگر داشتن
ایں عمل کم نیست از کبریت احمر داشتن

نسخهٔ تسخیر دلهای جهان دانی که چیست

حرف شیرین و زبان چون موج کوثر داشتن

ای که میداری سفر در پیش و عزم آن جهان

زاد راه تست دل از این جهان بر داشتن

تا نهادستی جبین عجز بر خاک نیاز

پس ترا زیباست سر تا آسمان بر داشتن

بر سر آوردن سپر در امتحانگاه وفا

پشت همچو داغ بیوفائی ننمودن داشتن

تا توانی دور کن زنگ هوس از خاطرت

ورنه آسان نیست چون آئینه جوهر داشتن

سبحهٔ شک و در رهٔ تحقیق میدانی که چیست

خار در پیراهن و نشتر به بستر داشتن

تکیه بر لطف خداوندی که هست آمرزگار

بهتر از اندیشهٔ کردار و کیفر داشتن

دوش احمد هست معراج امیر بت شکن

پس چه حاجت اندرون کعبه منبر داشتن

فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

امن اس دور قمر میں فلک پیر نہیں
دل میں سمجھے ہوئے ہیں اپنے کہ ہم بھی کچھ ہیں
سیف قاطع ہی میں پیشہ کیلئے احکام قضا
آفریں خامۂ نغمہ و رنگیں گفتار
باغ سبز اپنا دکھا ہمکو نہ ای طول امل
دم شماری میں گزر جاتی ہے انسان کی عمر

ہے کف افعیٔ شب کاسۂ زر تیر نہیں
خواب وہ دیکھا ہے جسکی کوئی تعبیر نہیں
ہے یہ بسمل کی تڑپ حیلہ و تدبیر نہیں
عندلیبوں کے ترانے ہیں یہ تحریر نہیں
سمجھے بیٹھے ہیں کہ توقف نہیں تاخیر نہیں
اس میں تقدیم ذرا بھی نہیں تاخیر نہیں

۱۱

آپ کو میرے دل زار سے کچھ کام نہیں
مشغلہ یہ بھی رہا دست جنوں کا چندے
زمزمہ سے دور جو منہ پھیرے ہوئے بیٹھی ہیں
رشک نغمہ سحری ہے ترا آویزۂ گوش
مجھکو طوطی کی طرح ذوق نوا سنجی ہے
وعظ کہنے کو چلے آئے ہیں میخوار و نہیں
ابر کی طرح سبک روح گذر جاتے ہیں
شعلۂ شمع نہیں ہوں میں ہوا ان نسیم
قلزم عشق کا پیراک نہیں میں نہ سہی
کھلتا ہے راز نہاں آتش جاں سوز نہیں

۲۴

خیر تو نہیں سہی تکرار سے کچھ کام نہیں
اب گریباں کے کسی تار سے کچھ کام نہیں
ہیں مسیحا جنھیں بیمار سے کچھ کام نہیں
اس ستارہ کو شب تار سے کچھ کام نہیں
ورنہ آئینۂ رخسار سے کچھ کام نہیں
شیخ کو خانۂ خمار سے کچھ کام نہیں
خلش وادیٔ پر خار سے کچھ کام نہیں
مجھکو خار سر دیوار سے کچھ کام نہیں
ڈوب مرنا ہے تو منجدھار سے کچھ کام نہیں
اور زباں کہتی ہے اظہار سے کچھ کام نہیں

صبح نو رس کے چٹکنے سے نہ ہو گی لیکن   آج گرتے ہوئے دیوار کو ہم دیکھتے ہیں

قطعہ اب ترکِ محبت کا زمانہ ہے قریب
اور حیا سے نگہِ یار کو ہم دیکھتے ہیں

مفاعیلن چار بار

۲۱   ۱۳۰

تو غمِ حسن جب تک ہو آنکھیں دیدہ وا دیدہ جہاں کر لیں
بندھا ہے تار جب تک تماشا تیلیاں کر لیں
اسیری میں بہار آئی ہے فریاد و فغاں کر لیں
قفس کو خونفشاں کر لیں قفس کو بوستاں کر لیں
کہ اپنا سخن ذاتی ہے گردوں قتل کے درپے
جو کہنا ہو وہ کہہ سن لیں جو کرنا ہو بیاں کر لیں
سفر تو اس قدر ہو دور کا اور پیچ کا رستہ
مناسب تھا کہ بے ناقہ کو محمل کو گراں کر لیں
حسینوں کی بہارِ حسن ہے مہمان دو روزہ
ادائیں گرمیاں کر لیں نگاہیں شوخیاں کر لیں
ضعیفی تیرا نہیں ہم کو شکایت قد کے جھکنے کی
زمیں سے کچھ دنوں فریاد و جورِ آسماں کر لیں
غرض ہے کسبِ عرفاں مجھ کو میخانہ میں آنے سے

جنھیں طوفاں اُٹھانا ہو وہ جو چاہیں گماں کر لیں

نہ آنا اے اجل تجھ کو قسم ہے وقتِ آخر تک
ابھی کچھ عمر باقی ہے اسے بھی رائیگاں کر لیں

خضر کو فاتحہ دینی ہے گر ہم خاکساروں کی
تو پہلے چشمۂ آبِ بقا سے کلّیاں کر لیں

خبر اس کی نہیں تھی دام زیرِ کاہ پنہاں ہے
ارادہ تھا کہ ہم بھی اس چمن میں آشیاں کر لیں

ہمارے ضبط کی گر پردہ داری دیکھنا چاہے
تو آ اے برق تجھ کو آشیاں میں ہم نہاں کر لیں

عجب کیا گر نہیں ملتا مرے سینہ میں تیر اُن کا
وہ ناوک پر قیاس معنیٔ خاطر نشاں کر لیں

نہ ہو کوئی ہنر انساں میں اک شیریں زبانی ہو
یہ افسوں پڑھ کے دشمن کو بھی ہم تو مہرباں کر لیں

ہماری رندی و مستی تو قابل منع کے ٹھہری
سرِ منبر بھلا واعظ تو ٹھنڈی گرمیاں کر لیں

سمجھتے ہیں کہ جینا نزع کی حالت میں بھی اچھا
جو بس ہو تو اجل کو کچھ دنوں ہم میہماں کر لیں

بھلا کیا فائدہ اہل جہاں سے ہم سخن ہو کر
اثر اتنا تو ہو آخر کسی کو ہم زباں کرلیں

ہمیں اس بزم میں دم صحبت گر نظر آ ئے
کلیجہ میں چھپا لیں اس کو آنکھوں سے نہاں کرلیں

مسیحا اُٹھ نہ بالیں سے ذرا یہ بھی تم ہی اور تو ہے
ٹھہر اے درد دل اتنا کہ دردِ دل بیاں کرلیں

چلا میں بزم سے پھر ذکر میرا نا مناسب ہے
شکایت میری جو کرنا ہو مجھ سے مہرباں کرلیں

ہوا یہ جب کہ ثابت عیش دنیا کا خیالی ہے
خیال عیش سے لازم ہے دل کو شادماں کرلیں

خزاں کے خوف میں گھلنے سے یہ اے نظم بہتر ہے
تماشائے گل و ریحان و باغ و بوستاں کرلیں

۲۰ ۱۲۱

گزرتے ہیں تو مثل سیل عالم سے گزرتے ہیں
ٹھہرتے ہیں تو مثل نقش پانی پر ٹھہرتے ہیں

صبا کی طرح پھیرا کو چۂ ہستی کا کرتے ہیں
کہ آزادانہ آجاتے ہیں مستانہ گزرتے ہیں

تماشے گیسوؤں کی برہمی کچھ جھوٹ تو نہیں ہے
گر پڑنے سے بیشتر بکھر نکلتے ہیں

حباب اٹھ کر قعر[1] دریا سے تا سطح آب آیا
ابھرنے والے جو ہیں ناتواں ہو کر ابھرتے ہیں

اگر فقر و غنی کے مسئلے کو غور سے دیکھو
تو سچ یہ ہے کہ دونوں نقطے بے حق ٹھہرتے ہیں

قلم سے ذوق سجدہ جادۂ تسلیم میں سیکھو
جو ہیں اہل وفا یوں سر بہ شمشیر دھرتے ہیں

ڈستے ہوں دل اپنے جب چہرے کی صفائی پھر کہاں تک
کہیں یہ داغ مٹتے ہیں کہیں یہ زخم بھرتے ہیں

صدائے طبل تہی کے ہی یہ شہرت اور یہ آوازہ
ہوا میں بھر کے ارباب ہوس آفاق ابھرتے ہیں

یہی دل ہے تو جینا ہو چکا اب عشق بازوں کا
تماشا ہے کسی کی شکل اچھی ہو تو یہ مرتے ہیں

ضعیفوں کے قد خم گشتہ ظالم وہ کمانیں ہیں
کہ جن کے تیر پشت پیر گردوں سے گزرتے ہیں

[1] قعر: بحر دریا کی تہ ۱۲

نہیں ڈرتے زمانہ جتنا چاہے امتحان کر لے
کھرے ہوتے ہیں جو وہ آگ میں گر کر نکھرتے ہیں
پرائے دل کی حالت کو کوئی اپنے ظلم کیا جانے
سمجھتے ہیں وہی جو دل پہ اپنے ہاتھ دھرتے ہیں

۱۶ — ۱۳۲

تری محفل میں جو آتے ہیں کچھ کھو کر نکلتے ہیں
وہ ہر سو ڈھونڈتے اپنا دل مضطر نکلتے ہیں
شگوفے لے کے سر پہ طبلۂ عنبر نکلتے ہیں
گل تر ساتھ سدا لگائے ہوئے مجمر نکلتے ہیں
بہار آئی اٹھا ہے جوش خون لالہ و گل میں
رگ سودا میں پیہم ڈوب کر نشتر نکلتے ہیں
کسی کے مطلع ابرو کو ہم نے پڑھ کے دیکھا ہے
عجب انداز پایا ہے عجب تیور نکلتے ہیں
شب غم اک بلائے بد ہے تارے میں گنوں کیونکر
ستارے بھی کچھ اس کے سایہ سے بچ کر نکلتے ہیں
جنھوں نے دل لگایا ہے نہیں لطف کیا جانیں
اجل کس طرح آجاتی ہے دم کیونکر نکلتے ہیں

نہ پوچھو کاوشِ مژگاں سے تیرے دل پہ کیا گزری
کہ یہ آنسو وہی ٹوٹے ہوئے نشتر نکلتے ہیں

بیابانِ بلا کی راہ سیدھی مل گئی مجھکو
بگولے سیکڑوں کھاتے ہوئے چکر نکلتے ہیں

ہراس بیمارِ غم کو دھن اوسی محفل میں جانے کی
مسیحا و خضر جس بزم سے مر کر نکلتے ہیں

بھری ہیں صانعِ قدرت نے موتی کوٹکر تجھ میں
عرق جو شرم سے آیا وہی گوہر نکلتے ہیں

جو نا پا تو حسینوں کے قدم تک تھا سرِ محشر
یہ ظالم حشر کے فتنہ سے بھی قد بھر نکلتے ہیں

مری فریاد اور لٹے گلا میرا دبا تی ہے
مرے نالے مجھی پر کھینچ کر خنجر نکلتے ہیں

بنائے جاتے ہیں کاجل کے دنبالے دمِ تزئیں
الٰہی خیر ہو تیرِ نگہ کے پر نکلتے ہیں

اشارہ ہی یہی اس شوخ کی ترچھی نگاہوں کا
انھیں گوشوں سے اکثر فتنۂ محشر نکلتے ہیں

نہیں کوشش سے کچھ دیوانگانِ عشق کو حاصل

محو ان کھو دیں تو سر سے اس یہ بھی تجھ پیدا
متاعِ صبر و ہوش اے ظلم تو نے چھینا تو سہی لیکن
خبر بھی ہے کہ اس رستے سے غارتگر نکلتے ہیں

لد ۲۳

ثنائے ساقی کوثر زبان شعر تر سے نکلتے ہیں
زمین شعر سے بھی چشمہ کوثر نکلتے ہیں
غنیمت ہے نفس کے ساتھ جو اخگر نکلتے ہیں
پنہ دیتا ارمان اپنے دل کے رہ رہ کر نکلتے ہیں
ازل میں نجم ماتم تھی مہ و خورشید سے پوچھو
کہ جیب سے یہ نکلتے ہیں برہنہ سر نکلتے ہیں
زباں سے میری گر شکوہ نہیں نکلا نہیں نکلا
اک آواز شکست رنگ سے و قفر نکلتے ہیں
غبار آئے کسی کے دل میں تجھ سے کیا قیامت ہے
سنا ہو گا کہ اکثر گرد سے لشکر نکلتے ہیں
حباب کو آئینہ سمجھیں طلسم قدرت حق کا
تو اک ذرہ سے سو بت خانہ آذر نکلتے ہیں
عبرت سے نقصان و کمال ماہ کو دیکھو

۱ نو مہ شکوہ ز ۱۲

جو پہلے سر پہ اٹھتے تھے وہ دبکر نکلتے ہیں

ہوانے ویسے اڑتی ہے مخمشہ ہو کر کو تر ہو

نفس میلوں میں ہم تخت سلیماں پر نکلتے ہیں

صدائے چنگ سے مجھکو یہی آواز آتی ہے

یہ کہتا ہے کوئی پردے سے ہم باہر نکلتے ہیں

گدائے بے نوائی ایک ٹھوکر سے جو گر اٹھے

ابھی لڑتے ہوئے دارا و اسکندر نکلتے ہیں

اٹھانے ہیں جہاں میں داغ جوہر گر نہ بھولونگا

یہ تیرے چند درہم اے فلک مجھ پر نکلتے ہیں

گذر جاتے ہیں یونہی روز سیارہ باسیہ قسمت پر

ستارے جس طرح اوس میں چھپ چھپکر نکلتے ہیں

نشانِ سوزِ غم باقی ہے میری خاک میں اب تک

دلِ پرداغ کے ٹکڑے ہیں جو اخگر نکلتے ہیں

کوئی دیکھے تو پہلے آپ سے باہر ذرا ہوکر

ابھی اس گنبدِ بے در سے صد با در نکلتے ہیں

دلِ بے آرزو جب سے ملا ہے قطعم حیراں ہوں

کسی کے منہ سے حرفِ آرزو کیونکر نکلتے ہیں

کھٹک ہر سانس میں ہے ہر نفس کے ساتھ نالے ہیں
کہ دل نازک ہے میرا اور دل کے زخم آلے ہیں

حیا میں ناز بھی ہے منہ پہ وہ آنچل جو ڈالے ہیں
ادا میں شرم بھی ہے اس طرح دامن سنبھالے ہیں

تری محفل میں مجھ سا کشتۂ حسرت نہیں کوئی
اداؤں نے بھی پر حوصلے دل کے نکالے ہیں

حجاب آتے ہی مژگاں کی صفیں ہو جائیں گی برہم
یہ ترکان قدر انداز گھونگھٹ کھانے والے ہیں

طریق عشق میں ہر ہر قدم ہے کام اژدر ہیں
وہاں مارکے چھالے ہیں جو تلوؤں کے چھالے ہیں

نہ پہونچے فیض اپنوں سے تو شکوہ اسکا کیا کیجئے
حباب بحر دست موج میں خالی پیالے ہیں

نہ ڈھونڈیں گے کہیں اب خانۂ دل کے سوا اسکو
مکاں کعبہ سے لیکر عرش تک سب دیکھے بھالے ہیں

جنھیں تکیہ خدا پر ہو زمیں پر کیوں قدم رکھیں
مصلے آب پر دوش ہوا پر مرگ چھالے ہیں

ملیں وحشت میں جاگیریں مجھے فرہاد و مجنوں کی
گریبانوں کے پرزے کوہ و صحرا کے قبالے ہیں

تری تصویر کو دیکھے ہوئے مدت ہوئی لیکن
مری آنکھوں میں اب تک کچھ اندھیرے کچھ اجالے ہیں

الٰہی رہ گئی تھی خاک میں بھی آہ کچھ باقی
مری مٹی سے جو ساغر بنے ان میں بھی چھالے ہیں

ملال انگیز ہو جاتی ہے افراط طرب آخر
کہ اپنی حد سے نغمے جب گذر جائیں تو نالے ہیں

قلم کی طرح سجدے ہی کروں میں تو اگر پاؤں
کہاں وہ لوگ ہیں جو بات پر سر دینے والے ہیں

کرم سے اس کے ہیں سامان کیا کیا بادہ نوشی کے
کبھی ساون کی جھڑیاں ہیں کبھی بادوں کے جھالے ہیں

وہ ناداں ہیں جو ملک و مال کو اپنا سمجھتے ہیں
کہ یہ آج اس کے قبضے میں ہیں کل اس کے حوالے ہیں

وہ اب کے سال ہی بوتل کا گلا دابتے ہیں کیفیت
عمامے زاہدوں نے مست ہو ہو کر اچھالے ہیں

نہ چھوٹی مر کے بھی اہل جہاں سے فیض رسانی

کفن نالے کا اڑنا بوتے کے اوپر رو شالے ہیں

جہاں تو جلوہ گر ہووے ہے تھا ضبطِ فغاں کرنا

نکلے آتے ہیں ان پر زخم جو دل کو سنبھالے ہیں

جو پہلے جا چکے ہیں انتظام میں ان کو تو کیا رونا

بڑھے جاتے ہیں وہ آگے جو میرے ساتھ والے ہیں

۱۳ — ۱۲۵

ہوئی یہ کثرتِ نشو و نما فصلِ بہاری میں

کہ بلبل دوڑتی ہیں نکہتِ گل کی سواری میں

مجھے فرقت کی شب یہ سوچ ہے اختر شماری میں

ستارے کہکشاں میں ہیں کہ دندانے مری آری میں

گریباں پھاڑیے گل کی طرح فصلِ بہاری میں

کہ دم گھٹنے لگا اب تو جنوں کی پردہ داری میں

حباب آسا کہیں ہم پا سرابِ دشت کچھ ہیں تو

کہ ہوئے اعتبار آتی ہے اس بے اعتباری میں

مرے حصے میں جامِ جم نہ کیوں اس بزم میں آئے

کہ میں بھی تو ہوں یکتائے زمانہ بادہ خواری میں

جنوں تکمیل ناسخ بہتر ہے کہ ہرگز ہو نہیں سکتا

تنبیر آب راکد کی طرح سے آب جاری میں
اڈھائی کو در و گوہر کے میں ہر اک سے جھلکتا ہوں
مجھے کان جواہر مل گئی ہے خاکساری میں
اجل نے تو مجھی چھوڑا کہ اک صید زبوں یہ ہے
یہاں دشوار جینا ہو گیا اس شرمساری میں
پشیماں ہونگے تجھکو شاہ خوباں کیوں کہا میں نے
نہ کی پھر بات ہی مجھ سے غرور شہریاری میں
ٹھہرا ہے سیل گریہ ہی جو عکس یار کی طالب
صفائی کی ہر صورت غیر ممکن بیقراری میں
غریب آزار کو فرعون اہل دل سمجھتے ہیں
وہ تخت عاج پر نکلے کہ سونے کی عماری میں
ہے اس سفاک کا بھی سامنا محشر میں حیدر
خدا جانے کہوں کیا عالم بے اختیاری میں

۱۰ — ۱۲۶

ابھی تک بحث امر کن فیکان جاری ہے عالم میں
فنا اک دم میں ہی سارا جہاں موجود اک دم میں
یعنی فیضان وجود ہر آن میں نہ ہوتا ہی تو عالم فنا ہو جائے آفتاب کی شعاعوں

جوانان چمن اترا نہ جائیں حسن پر اپنے

جہاں کی بے ثباتی آئینہ ہے دست شبنم میں

مری آنکھوں کے آگے تو نہ کر خوں اے اجل انکا

چھپا رکھی تھی ہیں نے آرزوئیں جان پرغم میں

کرو نیکی کسی سے مفت سب ممنون منت ہوں

جہاں ڈوبا ہوا ہے چشمہ احسان حاتم میں

سلیمان جہاں سمجھوں نہ کیوں اہل مروت کو

تبسم ہے لب رنگیں پہ جیسے نقش خاتم میں

حیا دی ہے خدا نے آنکھ میں اہل سعادت کی

نگہ ہے پرورش پائے ہوئے دامان مریم میں

فریب اہل دنیا سے نہیں مرد خدا ڈرتے

حقیقت حیلہ روباہ کی کیا چشم ضیغم میں

مجھے اس عالم افتادگی میں رشک آتا ہے

کہاں سے آگئی یہ طاقت پرواز شبنم میں

عجب ہے بزم مے میں سیر کرنا سارے عالم کی

کوئی قطرہ شراب عشق کا تھا ساغر جم میں

بقیہ | کا سلسلہ ذرا سا توقف ہو تو دنیا تاریک ہو جائیگی کل یوم ہو فی شان ۱۲

ملی شاہ و گدا کی خاک تو ہوتی تھیں یہ باتیں
ملاپ آخر ہوا اک عمر کے بعد آپ میں ہم میں

۱۲۷ مفعول مفاعیل مفاعیل مفاعیل ۲۰

گمراہ کیا نفس نے دنیائے دنی میں
رہزن کا مرا ساتھ ہے امن وطنی میں

تنہا نہ ملا گوشۂ مرقد بھی کسی کو
سنتے ہیں کہ کشتی ہوئی درویش و غنی میں

مقتل میں مجھے یوں جگر و دل نظر آئے
یہ تیر[1] لگے پیکاں میں وہ برچھی کی انی میں

سینہ میں ٹھہرتا نہیں دم تا بہ دم مرگ
کیسا یہ پس و پیش ہے امر شدنی میں

آئے تو کسی طرح سے اس بت کو تبسم
بجلی کی چمک دیکھ لو ہیرے کی کنی میں

جس نخل کو سیل فنا دیتی ہے پانی
مصروف وہی نخل کی ہے بیخ کنی میں

لازم ہے کہ داماں و گریباں میں ہو چاک
ہے موسم گل لطف ہے گل پیرہنی میں

کچھ پیر مغاں سے تجھے نسبت نہیں زاہد
ہوتا ہے بڑا فرق کریم اور دنی میں

رنگت تری لب کی ہے نزاکت نہیں لیکن
یاقوت بدخشاں نہ عقیق یمنی میں

بجلی سی چمک جاتی ہے کھنچتا ہے جو توسن
شاید دل بیتاب ہے برچھی کی انی میں

کی بات کی جس نے وہ ہوا کشتۂ حسرت
کیا زہر گھلا ہے تری شیریں سخنی میں

قبلہ سے جو نورو کی اٹھی ہیں گھٹائیں
ڈوبا ہے چمن رنگ عقیق یمنی میں

رہزن میں ہو نفس تو کر قتل کی تدبیر
کیا فرق ہے گردن کشی و گردن زدنی میں

[1] تیر اور برچھی مژہ اور نگاہ کے معنی میں ہے ۔ ۱۲

ہی نفس کی اصلاح تو بس نفس کشی میں
کچھ دل کی درستی ہی تو بس دل شکنی میں

ہر گز سخن تلخ میں دیکھی نہیں یہ بات
کچھ کام نکلتا ہی تو شیریں سخنی میں

ساتھ آئی ہی کچھ گرد کدورت جو وطن سے
پروا مجھے مرقد کی نہیں بیوطنی میں

چلتے ہیں وہ اب راہ ساری یہ قلم کے
جو شہرہ آفاق تھی شمشیر زنی میں

مل جائیگا محشر میں دل اس عربدہ جو کی
عادت یہ ہمیشہ کی ہی اس ناشدنی میں

کافر ہوں کسی بات کا مجھکو جو یقیں ہو
ملتا ہی مزہ آپ کو پیماں شکنی میں

کرتے ہیں وہ ظلم اور پشیماں نہیں ہوتے
سمجھے ہیں کہ آواز نہیں دل شکنی میں

۱۲۸ ———— ۳۱

اندیشہ ہی رہزن کا بھی ہر راہ گذر میں
اس طرح سے غافل کوئی سوتا ہی سفر میں

آنکھیں مری یوں محو تماشا ہیں دو تو بس
دو داغ تجھے گویا پر طاؤس نظر میں

کہتے ہیں غلط تیر لگایا نہیں تو نے
خود میں نے چھپایا ترے ناوک کو جگر میں

افسانہ رہا محفل عشرت کا ہمیشہ
وہ شمع کا جلوہ نہ رہا رات ہی بھر میں

پر خوف یہ منزل ہی سبکسار گذر جا
برسوں سے یہ آتی ہی صدا راہ گذر میں

ہیں شہر خموشاں میں کسی جا کی پکارو
دربر ہی مگر آواز نہیں حلقہ در میں

دیتا ہی وہ نعمت تو اٹھائی نہیں اٹھتی
پھولوں سی لچک آ گئی شاخ گل تر میں

گر اہل جہاں داغ اٹھائی نہیں جلتے
پھر کس لیے پیدا ہوئی اس دور قمر میں

بچپن سی جوانی ہی جوانی سی بڑھاپا
ہی خاتمہ عمر اسی شام و سحر میں

الجھوں نامۂ یار آنکھوں سے اپنی نہ لگاؤں / بھیجا ہو جسے باندھ کے جبریل کے پر میں

مست مے عرفاں کو کسی طرح سنبھالے / ایسا بھی ہے ہشیار کوئی اہل خبر میں

اس راہ میں دم نکلے تو کافور ہے کیا کام / گر دینا مجھے دفن اسی گرد سفر میں

کس طرح عنادل کے گلے میں اتر آئے / نغمے تھے نہاں پردۂ برگ گل تر میں

یہ شیشہ گری ابر نے کی ہے کہ ہوا نے / خلخال بلوریں ہے ہر اک ساق شجر میں

منظور اگر ہو دل مردہ کو جلانا / ہے معجز عیسی نفس باد سحر میں

حسرت ہے کبھی عمر گذشتہ کو کریں یاد / مہلت ہمیں اتنی نہ ملی آٹھ پہر میں

گھیرے ہوئے ہے خلق کو یوں نعمت خالق / جس طرح سے [illegible] شکر میں

نکلا نہ کسی سوزن مژگاں سے مرا کام / برسوں ہی [illegible] جگر میں

کہتی ہے یہ دانتوں کی چمک وقت تبسم / ڈورے کی جگہ برق ہے اس عقد گہر میں

ہے اس کی ادا آفت عالم دم رفتار / تلوار لگا دی ہے نزاکت نے کمر میں

اس بزم میں ہے نظم جنھیں لطف نہ آئے
حافظ کی غزل میر کی رباعی عمر میں

مفتعلن مفاعلن (۲) بار

سنگ جفا کا غم نہیں / دست طلب کا ڈر نہیں

اپنا ہے اس پہ آشیاں / نخل جو بار ور نہیں

سنتے ہو اہل قافلہ میں کوئی راہبر نہیں
دیکھ رہا ہوں تم میں سے ایک بھی راہ پر نہیں

موت کا گھر ہے آسماں اس سے کہیں مفر نہیں
نکلیں تو کوئی در نہیں بھاگیں تو رہگذر نہیں

پہلے جگر پہ آہ کا نام نہ تھا نشاں نہ تھا
آخر کار یہ ہوا آہ تو ہے جگر نہیں

صبح ازل سے تا ابد قصہ نہ ہو گا یہ تمام
جور فلک کی داستاں ایسی کبھی مختصر نہیں

برگ خزاں رسیدہ ہوں چھیڑ نہ مجھ کو اے نسیم
ذوق فغاں کا ہے مجھے [illegible] و ابر تر نہیں

منکر حشر ہے کدھر دیکھے تو آنکھ کھول کر
حشر کی [illegible] ایسی کوئی [illegible] نہیں

شبنم و گل کو دیکھ کر وجد نہ آئے کس طرح
خندۂ بے سبب نہیں گریۂ بے اثر نہیں

تیرے فقیر کا غرور تاجوروں سے ہے سوا
طرف کلہ میں دے شکن اس کو یہ درد سر نہیں

کوشک و قصر و بام و در تو نے بنا کئے تو کیا

حیف ہو خانماں خراب دل میں کسی کے گھر نہیں

نالہ کشی رقیب سے میری طرح محال ہے

دل نہیں حوصلہ نہیں زہرہ نہیں جگر نہیں

شاطر پیر آسماں واہ رے تیری دستبرد

خسرو و کیقباد کی تیغ نہیں کمر نہیں

شان کریم کی یہ ہے ہاں سے ہو پیشتر عطا

لطف عطا کا کیا ہو جب ہاں سے ہو پیشتر نہیں

لاکھ وہ بیرخی کرے لاکھ وہ کج روی کرے

کچھ تو ملال اس کا ہو دل کو مرے مگر نہیں

سن کے برا نہ مانئے سچ کو نہ جھوٹ جانئے

ذکر ہے کچھ گلہ نہیں بات ہے نیشتر نہیں

حرف واو

۱۳ ـــــ مفاعیلن چار بار ـــــ ۳۰

ندامت ہے بنا کر اس چمن میں آشیاں مجھ کو

ملا ہمدم یہاں کوئی نہ کوئی ہمزباں مجھ کو

دکھائے گا جوانی توسن عمر رواں مجھ کو

ہلال برق سمر رکھے ہم رکاب و ہم عناں مجھ کو

بنایا ناتوانی نے سلیمان زماں مجھ کو

اڑا کر لے چلے موج نسیم بوستاں مجھ کو

دم تیغ ازل سے ہیں نواسنجوں میں ہوں پیشے

بتایا بلبل سدرہ نے انداز فغاں مجھ کو

میری باتوں میں کیا معلوم کب سوئی وہ کب جاگے

سرے تو اس لئے کہنی پڑی پھر داستاں مجھکو

جدا کر قافلہ سے وہ نسیم زار کو پھینکا

کہ موج سیل بخشی بانگ درائے کارواں مجھکو

یہ دل کی بیقراری خاک ہو کر بھی نہ جائے گی

سناتی ہے لب ساحل سے یہ ریگ رواں مجھکو

اڑائی خاک جس صحرا میں تیرے واسطے میں نے

تھکا ماندہ ملا ان منزلوں میں آسماں مجھکو

تصور شمع کا جس کو جلاوے ہوں وہ پروانہ

لگ اٹھی آگ دل میں جب نظر آیا دھواں مجھکو

تمہارے سو عرصۂ محشر تک آیا ناتواں ہو کر

کہاں سے حسرت دیدار لے آئی کہاں مجھکو

وہ جس عالم میں جا پہونچا وہاں میں کسطرح جاؤں
ہوا دل آپ سے باہر پہنا کر بیڑیاں مجھ کو
غبار راہ سے اے تک یہ آواز آتی ہے
گئی اے عمر رفتہ تو کدھر پھینکا کہاں مجھ کو

١٢ ١٣١

نہیں پروا جو ظالم نے مٹایا میری تربت کو
لحد بن جائے گر ظاہر کروں دل کی کدورت کو
کسی نے شعلہ ساں آنچل میں باندھا ہے شرارت کو
گرہ میں باندھ لے اب مثل انگور داغ حسرت کو
ترے ممنون ہم سب رند اے باد بہاری میں
اوڑا لاتی ہے میخانہ پہ تو باران رحمت کو
یہ وہ دن ہیں کہ اب آنکھوں کو اپنی ڈھونڈتے ہیں ہم
گئے وہ دن کہ آنکھیں ڈھونڈتی تھیں اسکی صورت کو
نکل جاتا ہے نام اک شعر اگر اچھا نکل آئے
یہ دو مصرع تو گویا پر لگا دیتے ہیں شہرت کو
ہوا سالک کو حاصل کیا دو صد زانو تامل سے
کہ دیکھا گام اول میں دو صد آئینہ حیرت کو

نگاہ آشنا کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں
پس پشت اپنے گویا ڈھونڈھتے ہیں مروت کو

حسینوں کو کیا گرویدہ اس نے آئینہ بن کر
دل وارفتہ نے جس طاق پر رکھا تھا حیرت کو

کہیں الزام محشر میں نہ ہو اس بے وفا قاتل کا
میرے لاشہ پہ لے آئے کوئی اس بے مروت کو

پلک جھپکا کے نرگس کو نہ دیکھا باغ میں ہم نے
جو آنکھیں ہوں تو بس دیکھا کرے صانع کی قدرت کو

بیاباں ہو ابھی زندہ [illegible]
جھٹک دوں میں اگر دامن سے اپنی گرد کلفت کو

نہ تھی لے قطع تدبیر اور کچھ دل [illegible]
گریباں سے [illegible] دست وحشت کو

١٤ ١٣٢

عجب شوریست از حرف دل [illegible]
شب بازندہ می دارم ساقہ در پہلو

خوشم آید ز ساغر خندہ سرشار [illegible]
خوشم آید زمینا گریہ مستانہ در پہلو

وفورِ مستی من کرد برہم وضعِ محفل را
در آغوش است ساقی شیشہ و پیمانہ در پہلو

نمی دانم چہ افسوں کرد بر من نشۂ ہستی
نگاہم محوِ غیر و جلوۂ جانانہ در پہلو

خوشا عرفاں اگر از ما سوا پہلو تہی کردی
ببیں گر گنج خالی نیست ایں ویرانہ در پہلو

زدم بر شمعِ بالیں آستینے در شبِ ہجراں
دلم می سوخت از بیتابیِ پروانہ در پہلو

بشمعِ قامتِ آں ترکِ حسن فتنہ زا باشد
کہ خود تیغش بلرزد چوں پرِ پروانہ در پہلو

تنم را زار کرد است آنچناں سودائے زلفِ او
نمایاں استخوانہا گشتہ مثلِ شانہ در پہلو

بشورِ انقلابِ دہر گوئی در غلطان است
بہر پہلو کہ غلطد دارد آب و دانہ در پہلو

ہمانا چارۂ داغِ دل از مرہم نمی آید
کہ دارم پنبہ بر پہلو و آتش خانہ در پہلو

دلم محوِ طلسماتِ جہاں من طالبِ صانع

ہوائے کعبہ در سر دارم و بت خانہ در پہلو

خوشا وقت قدح خواری کہ گردش می کند باہم
ببزمش ساغر و ہم سبحہ صد دانہ در پہلو

چہ طور از نگارستہا کہ بنوشتم باد آخر
کہ ہر یک نقطہ دارد معنی بیگانہ در پہلو

چو گل با خار بینی جائے فریاد است اے حیدر
کہ دل سوزد لبش پر خندہ و بیگانہ در پہلو

۲۵

۱۳۴

عبث ہے ناز استغنا پہ کل کی کیا خبر کیا ہو
خدا معلوم یہ سامان کیا ہو جائے سر کیا ہو

یہ آہ بے اثر کیا ہو یہ نخل بے ثمر کیا ہو
نہ ہو جب دردہی یارب تو دل کیا ہو جگر کیا ہو

جہاں انسان کھو جاتا ہو خود پھر اسکی محفل میں
رسائی کس طرح ہو دخل کیونکر ہو گذر کیا ہو

نہ پوچھو لگا بیٹھی جام ہیں زہر یا امرت
تمہارے ہاتھ سے اندیشۂ نفع و ضرر کیا ہو

مروت سے ہو بیگانہ وفا سے دور ہو کوسوں

یہ سچ ہے نازنین ہو خوبصورت ہو مگر کیا ہو
شگوفے دیکھ کر مٹھی میں زر کو مسکراتے ہیں
کہ جب عمر اس قدر کوتاہ رکھتے ہیں تو زر کیا ہو
رہا کرتی ہے یہ حسرت مجھے زہد ریائی پر
خدا سے جو نہیں ڈرتا اوسے بندہ کا ڈر کیا ہو
کہا میں نے کہ ظالم مبتلا مرتا ہے حسرت میں
کہا اوس نے اگر مر جائے تو میرا ضرر کیا ہو
کہا میں نے کہ ہے سوز جگر اور اف نہیں کرتا
کہا اس کی اجازت ہی نہیں پھر نوحہ گر کیا ہو
کہا میں نے کہ دے اوس کو اجازت آہ کرنے کی
کہا اوس نے بھڑک اٹھے اگر سوز جگر کیا ہو
کہا میں نے کہ آنسو آنکھ کا لیکن نہیں تھمتا
کہا آنکھیں کوئی تلووں سے مل ڈالے اگر کیا ہو
کہا میں نے قدم بھر پر ہے وہ صورت دکھا آؤ
کیا منھ پھیر کر اتنا کسی کو درد سر کیا ہو
کہا میں نے اثر مطلق نہیں کیا سنگدل ہے تو
کہا جب دل ہو پتھر کا تو پتھر پہ اثر کیا ہو

کہا میں نے جو مر جائے تو کیا ہو سوچ تو دل میں
کہا نا عاقبت اندیش نے کچھ سوچ کر کیا ہو
کہا میں نے خبر بھی ہے کہ دی جاں اوس نے گھٹ گھٹ کر
کہا مر جائے چپکی سی تو پھر مجھ کو خبر کیا ہو

۱۴ ۱۲۴

مجھی کو کہہ رہے ہو سب کہ سرگرم فغاں کیوں ہو
کوئی اس سے نہیں کہتا کہ تم نامہرباں کیوں ہو
نہ کھینچو اے چارہ گر پیکان قاتل میرے سینے سے
ملیں یوں دل سے دل باہم تو کوئی درمیاں کیوں ہو
سرائے دہر میں ٹھہرے تو پھر شکوہ شکایت کیا
جسے خون جگر کھانا ہو وہ مہماں کیوں ہو
یکایک پھیر لینا آنکھ کا بس قہر ڈھاتا ہے
اگر کہہ سن کے بگڑو بھی تو مرگ ناگہاں کیوں ہو
ملے گی داد کیا محشر میں ہم کو اس ستمگر سے
نہیں ہونا ہوا کچھ تو پھر شور و فغاں کیوں ہو
قیامت آج ہی آ جائے صور حشر پھنک جائے
شب غم میں سجے کیوں صبح کی نوبت اذاں کیوں ہو

جب اپنی خو یہ ٹھہرے منہ میں جو آئے سو کہہ جانا
تو پھر کہنا کسی کا طبع نازک پر گراں کیوں ہو

اشارہ میں گلِ نرگس نے پوچھا اسکی آنکھوں سے
فدا میں تم پہ تم بیمار کیوں ہو ناتواں کیوں ہو

نہ دیوانوں کے منہ لگ تو نہ ایسی گت بنی ناصح
اڑیں دامن کے کیوں پرزے گریباں دھجیاں کیوں ہو

وہ میرا جستجو میں اس کی جانا زمرہ خوباں میں
اور اس کا بدگمانی سے یہ کہنا تم یہاں کیوں ہو

اسے بے مانگے ہی دینے کی عادت تو نے ڈالی ہے
تو شرمندہ کسی کا پھر گدائے آستاں کیوں ہو

سمجھ لے دہر کو جاتا ہوا سیلاب ہے ورنہ
حباب آسماں کے ساتھ موج کہکشاں کیوں ہو

خبر لو ایک رنگ آتا ہے اک جاتا ہے چہرہ کا
تلوّن گر نہ ہو تو تیوریوں میں موجِ چیں کیوں ہو

تڑپنا نیم بسمل ہو کے حیدر تھا مقدر میں
رکے ہیں جب ہی مجھ سے تو پھر خنجر رواں کیوں ہو

ملے ہیں نقش جو ہم بوریا نشینوں کو
وہ دستیاب نہیں شاہوں کے نگینوں کو

کیا ہے صاف دلوں کی جو دوربینوں کو
تو ساتھ پردوں میں دیکھا گئے حسینوں کو

ہزار طرح سے پہلو تہی وہ کرتا ہے
کہیں جگہ نہیں ملتی ہے ہم نشینوں کو

گلہ بھی اس کے تغافل کا ہو نہیں سکتا
غرور و ناز ہی زیبا ہے نازنینوں کو

چمن کی سیر مبارک ہو تجھ کو اے نرگس
کسے یہ تاب کہ دیکھا کرے حسینوں کو

یہاں جہاں مری فکر بلند کا ہے عمل
نہ آسماں سے بدلوں میں ان زمینوں کو

ہوس رہی نہیں دولت کی خاکساری میں
کہ اس زمین نے سرکا دیا دفینوں کو

بتا دیا ہے ہمیں ساقی ازل نے بھی
کہ اپنے رنگ میں تو کھینچ ہم نشینوں کو

نہ پوچھ باد صبا موسم خزاں کا ملال

بسر کیا ہے بری طرح ان مہینوں کو
چھپائیں چاند کو کیا خاک ڈال کر اے ظلم
بھلائیں دل کی کدورت سے مہ جبینوں کو

۱۸ ۱۳۶

کیا شراب نے رنگین آبگینوں کو
تو رنگ دیا ترے ساعد نے آستینوں کو
ہوس مقابلہ کی اوس سے تھی حسینوں کو
صفیں الٹ گئیں الٹا جو آستینوں کو
خدا کرے نہ کبھی کوئی کا دست نگر
کہ بار بار چڑھاتے ہیں آستینوں کو
تباشنے یار سے کس طرح دیتے ہم تشبیہ
قبائے گل میں نہ دیکھا تھا آستینوں کو
جہاں رہے اہل ہوس ہاتھ اٹھا نہیں سکتے
ہزار بار چڑھایا ہے آستینوں کو
کوئی غبار کے پردے میں ہو نہ دامن گیر
الٹ لے آئینہ پروا ز آستینوں کو
شکستہ [illegible] گئے ہیں نازکی سے [illegible]

اس دشت سے گزر تو سبکباری سے گزر
اس طرح چاہیے کہ کہیں نقش پا نہ ہو

پھیلاؤ آشنا پاؤں نہ دنیا کو دیکھ کر
گھر جس کو اپنا سمجھے ہو مہماں سرا نہ ہو

کیا پوچھتے ادھ کھلے پھولوں کو وہ گلگلا نہیں
کیا چاندنی کا لطف جو وہ مہ لقا نہ ہو

مشکل پسند میری طبیعت ہے شوق میں
جاتا ہوں اس طرف کہ جدھر راستا نہ ہو

حیراں ہوں میں دعا ہی کہ یہ کونسا ہے نظم
کہتے ہیں مجھ کو دیکھ کے تیرا برا ہو

۱۴ فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلات

یادگار رفتگاں لکھنؤ

ہوں قد آدم غبار کارواں لکھنؤ
نوحہ حسرت کہہ رہا ہے داستانِ لکھنؤ

رہ گیا ہے اب یہی رنگیں بیانِ لکھنؤ
گوش عبرت سے سنے کوئی مری فریاد ہے

بلبل خوش نوائے بوستاں لکھنؤ
میرے ہر آنسو میں اک آئینہ تصویر ہے

میرے ہر نالہ میں ہے طرز فغانِ لکھنؤ
ڈھونڈھتا ہے اب کسی لے کر چراغ آفتاب

کیوں مٹایا اے فلک تو نے نشانِ لکھنؤ

لکھنؤ جن سے عبارت تھی ہوئے وہ ناپدید
ہے نشانِ لکھنؤ باقی نہ شانِ لکھنؤ

اب نظر آتا نہیں وہ مجمعِ اہلِ کمال
کھا گئے ان کو زمین و آسمانِ لکھنؤ

پہلے تھا اہلِ زباں کا دور اب گردش میں ہیں
چاہیئے تھی تیغِ اردو کو فسانِ لکھنؤ

مرثیہ گو کتنے یکتائے زمانہ تھے یہاں
کوئی تو اتنوں میں ہوتا نوحہ خوانِ لکھنؤ

یہ غبارِ ناتواں خاکسترِ پروانہ ہے
خاندان اپنا تھا شمعِ دودمانِ لکھنؤ

چلتا تھا جب گھٹنیوں اپنے یہاں طفلِ رضیع
سجدہ کرتے تھے اُسے گردن کشانِ لکھنؤ

عہدِ پیرانہ سری میں کیوں نہ شیریں ہو سخن
بچپنے میں ہے نے چوسی ہے زبانِ لکھنؤ

گلشنِ فردوس پر کیا نازہے رضواں تجھے
پوچھ اس کے دل سے جو ہے رتبہ دانِ لکھنؤ

بوئے اُنس آتی ہے حیدر خاک ٹیا برج سے

جمع ہیں اک جا وطن آوارگان لکھنو

فغاں از آہ و زاری دل دیوانہ در پہلو
شب ما زندہ می دارد ہمیں افسانہ در پہلو
دل من سوخت ناگاہ پرتوے از شمع رخسارش
فغاں کیں شعلہ افتادہ است بیباکانہ در پہلو
خوشم آید ز ساغر خندہ سرشار بر رویم
خوشم آید ز مینا گریہ مستانہ در پہلو
و فور مستی من کرد برہم وضع محفل را
در آغوش است ساقی شیشہ و پیمانہ در پہلو
نمی دانم چہ افسوں کرد بر من نشہ ہستی
نگاہم محو غیر و جلوہ جانانہ در پہلو
خوشا عرفاں اگر از ما سوا پہلو تہی کردی
بہ بیں کز گنج خالی نیست ایں ویرانہ در پہلو
زدم بر شمع بالیں آستینے در شب ہجراں
دلم می سوخت بہر بے تابی پروانہ در پہلو
بشمع قامت آں ترک حسن فتنہ زا باشد

که خود تیغش بلرزد چوں پر پروانه در پہلو

تنم را زار کرد است آنچناں سودائے زلف او

نمایاں استخواں ہا گشته مثل شانه در پہلو

بشر در انقلاب دہر گوئی در غلطاں است

بہر پہلو که غلطد دارد آب و دانه در پہلو

ہمانا چاره داغ دل از مرہم نمی آید

که دارم سینه بر پہلو و آتش خانه در پہلو

مثل شد در تناسب چشم و ابرویش چو در عالم

ز راه شوق مسجد می کشد میخانه در پہلو

دلم محو طلسمات جہاں من طالب صانع

ہوائے کعبه در سر دارم و بتخانه در پہلو

خوشا وقت قدح خواری که گردش میکند باہم

بزمش ساغر و ہم سبحه صد دانه در پہلو

چه طومار شکایتہا که بنوشتم باو آخر

که ہر یک لفظ دارد معنی بیگانه در پہلو

چو گل با خار بینی جائے فریاد است اے حیدر

که دل سوزد لبش پر خنده و بیگانه در پہلو

کس لیے چھپتے ہیں یہ شمس و قمر دونوں ساتھ
کس کو یہ ڈھونڈتے ہیں برہنہ سر دونوں ساتھ

کیسی یارب یہ ہوا صبح شب وصل چلی
بجھ گیا دل مرا اور شمع سحر دونوں ساتھ

بعد میرے نہ رہا عشق کی منزل کا نشاں
مٹ گئے راہرو و راہ گذر دونوں ساتھ

اے جنوں دیکھ اوسی صحرا میں اکیلا ہوں میں
رہتے جس دشت میں ہیں خوف و خطر دونوں ساتھ

مجھ کو حیرت ہے شب عیش کی کوتاہی پر
یا خدا آئے تھے کیا شام و سحر دونوں ساتھ

اس نے پھیری نگہ ناز یہ معلوم ہوا
کھنچ گیا سینے سے تیر اور جگر دونوں ساتھ

غم کو دی دل نے جگہ دل کو جگہ پہلو نے
ایک گوشے میں کریں گے یہ بسر دونوں ساتھ

اس کو روکوں میں الٰہی کہ سنبھالوں اس کو
کہ تڑپنے لگے دل اور جگر دونوں ساتھ

ناز بڑھتا گیا بڑھتے گئے جوں جوں گیسو
بل کی لینے لگے اب زلف و کمر دونوں ساتھ

تجھ سے مطلب ہے نہیں دنیا[1] و عقبیٰ سے غرض
تو نہیں جب تو اجڑ جائیں یہ گھر دونوں ساتھ

بات سنتا نہ کسی چاہنے والے کی کبھی
کان میں پھونک رہے ہیں یہ گہر دونوں ساتھ

آندھیاں آہ کی بھی اشک کا سیلاب بھی ہے
دیتے ہیں دل کی خرابی کی خبر دونوں ساتھ

کیا کہوں زہرہ و خورشید کا عالم اے نظم
نکلے خلوت سے جو نہیں وقت سحر دونوں ساتھ

---

[1] دنیا میں الف مقصورہ ہے لہٰذا اس کا متحرک کر لینا جائز ہے

۱۴۱ —— ۱۱

یوں تو نہ تری جسم نہ ہیں زینہار ہاتھ
دینے کے اے کریم مگر ہیں ہزار ہاتھ

انگڑائیوں میں پھیلتے ہیں بار بار ہاتھ
شیشہ کی سمت بڑھتے ہیں بے اختیار ہاتھ

ڈوبے ہیں ترک سعی سے افسوس تو یہ ہے
ساحل تھا ہاتھ بھر پہ لگاتے جو چار ہاتھ

آتی ہے جب نسیم تو کہتی ہے موج بحر
یوں آبرو سمیٹ اگر ہوں ہزار ہاتھ

دیتے ہیں میرے قتل کے احباب اور میں
خوش ہوں کہ میرے خون میں رنگتے ہیں یار ہاتھ

دامن کشاں چلی ہے بدن سے نکل کے روح
کھنچتے ہیں پھیلتے ہیں جو یوں بار بار ہاتھ

مٹتا نہیں نوشتۂ قسمت کسی طرح
پتھر سے سر کو پھوڑ کے زانو پہ مار ہاتھ

ساقی سنبھالنا کہ ہے لبریز جام مے
لغزش ہے میرے پاؤں میں اور رعشہ دار ہاتھ

مضطرب سے پوچھ مسئلۂ جبر و اختیار
کیا تال میں یہ اٹھتے ہیں بے اختیار ہاتھ

میں اور وہ ہوں علائق دنیا کے دام میں
میرا نہ ایک ہاتھ نہ اس کے ہزار ہاتھ

اے نظم وصل میں بھی ہا تو نہ چین سے
دل کو ہوا قرار تو ہے بے قرار ہاتھ

حرف ی

فاعیل فاعلات فاعیل فاعلات

۱۴۲ —— ۱۰

جھگڑا پڑا ہوا ہے نکلنے میں جان کے
کچھ حوصلے ابھی ہیں اُسی امتحان کے

آئی بہار اور خفقانی جہان سے ‌ ‌ ‌ جنگل میں سیر کے گئے خاک چھان کے

لایعقلانہ طرز میں سارے جہان کے ‌ ‌ ‌ کیسی شرارتیں وہ زمیں سے آسمان کے

کیا دیر انقلاب میں اب تھی جہان کے ‌ ‌ ‌ نالے پہنچ گئے ہیں قریب آسمان کے

دکھلا دو منہ ذرا صف محشر میں آن کے ‌ ‌ ‌ اوڑ جائیں ہوش آج بھی سارے جہان کے

چاہے تو دو جہاں کو ڈبو دے یہ طفل اشک ‌ ‌ ‌ مٹھی میں ہیں یہ سات ورق آسمان کے

حیران ہوں گلہ جو کسی سے کروں تو کیا ‌ ‌ ‌ جو دل کا حال ہے نہیں قابل بیان کے

یا رب تلک پہنچ گئے تو حلقہائے زلف ‌ ‌ ‌ قلابے مل گئے ہیں زمیں آسمان کے

ہے مغتنم کہ ہجر میں رونا ہی آ گیا ‌ ‌ ‌ آنکھوں پہ لوں گا میں قدم اشک مہمان کے

سمجھا چھوڑا لگا تھا میں دل اٹھا کے ہاتھ ‌ ‌ ‌ دل ہاتھ دھو کے پیچھے پڑا میری جان کے

کوندا یہ کہہ رہا ہے کہ ہے فوج گل قریب ‌ ‌ ‌ کہسار تک پہنچ گئے ہاتھی نشان کے

شیریں ہیں تیری گالیاں بھی حرف تلخ ‌ ‌ ‌ اوصاف کس زبان سے ہوں اس زبان کے

پاتا ہے تجھے نہ عالم اجسام میں کہیں ‌ ‌ ‌ چھان آئی فکر سات طبق آسمان کے

اب تک میں سن رہا ہوں صدائے الست کو ‌ ‌ ‌ گویا حجاب قدس یہ پردے ہیں کان کے

احسان سر پہ لے تو کسی با وقار کا ‌ ‌ ‌ ٹھہرے اگر تو سایہ میں اونچے مکان کے

آنکھوں کے سامنے سے گیا ہے وہ قافلہ ‌ ‌ ‌ دیکھے جہاں ہیں لوگ نہ اس آن بان کے

بہتر ہے تو بھی اے نفس واپسیں نہ آ ‌ ‌ ‌ کب تک اوٹھاؤں ضعف میں صدمے تکان کے

سوتے میں چشم غول کو سمجھا چراغ بام ‌ ‌ ‌ مارا پڑا میں دھیان میں تیر کمان کے

اے دودِ آہ ہو گئی رسوائیوں کی حد | جھنڈی پہ چڑھ گئی ہے یہ ہاتھی نشان کے

اے نظمِ بزمِ عیش پہ مقتل کا ہے گماں
چھریاں یہ چل رہی ہیں کہ فقرے ادا ان کے

۱۴۴ ——— ۲۱

روکے ہوئے ہے بن کے حصارِ آسماں مجھے | ذوقِ وصال کھینچ کے لایا کہاں سے مجھے

لے تو چلا ہے توسنِ عمرِ رواں مجھے | اس کی خبر نہیں کہ گرا دے کہاں مجھے

ہوش و خرد ملے مجھے تاب و تواں مجھے | اس کے عوض اٹھانا ہے بارِ گراں مجھے

ہوں قلزمِ فنا میں سہارے پہ سانس کے | دیکھے اے حباب خوب بنایا بادباں مجھے

جب سے کنارہ میں نے کیا سرو کی طرح | یکساں ہے اس چمن کی بہار و خزاں مجھے

کچھ کہہ رہی تھی شہرِ خموشاں کی خامشی | کوئی سنے تو یاد ہے اک داستاں مجھے

جلدی نہ کر تعلقِ دنیا ہے سدِّ راہ | اے موت توڑنا ہے یہ بندِ گراں مجھے

اچھا اگر نہیں شنوائی نہیں سہی | اس کا علاج کیا کہ ہے ذوقِ فغاں مجھے

کہتا ہے اوٹھتے بیٹھتے واماندوں کا غبار | کیوں ٹھوکروں میں لے نہ گیا کارواں مجھے

خود کو سنبھالتا کہ میں دل کو سنبھالتا | اک بیخودی تھی ہوش تھا یا رب کہاں مجھے

دیکھا شعارِ اہلِ ورع سمعہ و ریا | آئی پسند صحبتِ دیرِ مغاں مجھے

سن لے یہ کہہ رہا ہے زمانہ شباب کا | وقتِ عزیز میں ہوں نہ کر رائگاں مجھے

بھولا ہوا ہوں عہد کو صبحِ الست کے | پہلا سبق ہوا نہیں اب تک رواں مجھے

ناوک لگا رہا ہے اس انداز سے کوئی
لہرا رہی ہے موج ترنگ کماں مجھے

سر میں سفیدی آگئی باقی ہے پھر بھی جوش
پچھلے کی چاندنی میں ہے خواب گراں مجھے

کچھ کم نہ تھا بہار کا غم اس پہ یہ ستم
رہ رہ کے چھیڑ جاتی ہے باد خزاں مجھے

آفات دہر سے تھا ہراساں میں کس قدر
دی مرگ ناگہاں نے نوید اماں مجھے

رحمت نصیب خلق ہے راحت نہیں نصیب
تنکے چنے میں جب تو ملا آشیاں مجھے

خواہش کی پیروی سے ہے جہنم کا سامنا
گلشن میں لے چلی ہوس گلستاں مجھے

باہم جو اتحاد ہے پایا نہیں رقیب
اس کے وہاں آئے تو میری یہاں مجھے

اے نظم کوہ و دشت میں گھبرا رہا ہوں اب
بانگ جرس ہوں چھوڑ چلا کارواں مجھے

۱۴۳ ۲۲

گزری نسیم باغ کو شاداں کئے ہوئے
رہ جاتے ہیں جہان میں احساں کئے ہوئے

رخ ہے عدم کا عمر گریزاں کئے ہوئے
ہستی کو گرد جنبش داماں کئے ہوئے

تھی صبح ظلمت شب غم سے ڈری ہوئی
آئی چراغ کو تہ داماں کئے ہوئے

کیا جلد جا رہا ہے زمانہ نشاط کا
اسپ عناں گسستہ کو جولاں کئے ہوئے

آیا تھا جوش لالہ و گل کی طرح شباب
جاتا ہے خون حسرت و ارماں کئے ہوئے

دشمن سے رنج پہنچے تھے وہ سب بھلا دئے
بھولا نہیں ہوں دوست کے احساں کئے ہوئے

میدان بازپرس میں دیوانگان عشق
بیٹھے ہیں چاک دفتر عصیاں کئے ہوئے

[illegible] قیمت میں چاہیے

[illegible] پاسباں میں چاہیے

۱۴۵ — ۱۰

پہلو میں دل ہے آرزوئے یار کے لئے
آنکھیں ملی ہیں حسرت دیدار کے لئے

طاعت پہ تجھ کو ناز ہے رحمت پہ مجھ کو ناز
زاہد یہ حصن حصیں ہے بیکار کے لئے

روئیں تن کھڑے ہیں قیامت کے خوف سے
شاہد ہیں بال بال گنہگار کے لئے

کانٹوں نے پیرہن کو تبرک بنا لیا
ایک ایک تار لے لیا دستار کے لئے

اب کے عجب نہیں جو ہوئے بہار سے
[illegible] بیمار کے لئے

دیکھا نگاہ بھر کے جو آنکھوں نے یار کو
[illegible] کے لئے

لالچ ہے مال و زر کا بری طرح کا [illegible]
[illegible] کے لئے

پہلو میں دم زدن سے غم و یاس کا ہجوم
دل [illegible] کے لئے

یاد آتی ہے ہوا تری کوچے کی خلد میں
دل لوٹتا ہے سایۂ دیوار کے لئے

حیدر کو سلسلہ تھا ان گیسوؤں سے کچھ
لیکن الجھ پڑے ہیں [illegible] کے لئے

۱۴۶ — ۱۱

اعمال کے سبب سے گراں بار ہو گئے
جو مرحلے تھے سہل وہ دشوار ہو گئے

سکتے میں بھی نہ آئینہ دکھلائیں چارہ گر
اب کوئی منہ دکھانے کی صورت نہیں رہی

دل کو سنبھالے رہتے تھے پہلے ہمیں اور اب
خود کو سنبھالنے کی بھی طاقت نہیں رہی

مانند ابر گو کہ سراپا بخار ہیں
مانند برق نبض میں سرعت نہیں رہی

تلووں کو شوق خار مغیلاں نہیں رہا
سر میں ہوائے وادی وحشت نہیں رہی

وہ انتظار وصل کی شب کا گذر گیا
وہ بیقراری شب فرقت نہیں رہی

ماتم ہی ہم شباب کا کرتے تمام عمر
مجبور ہیں کہ ہاتھ میں طاقت نہیں رہی

ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ جنت کی تھی بہار
لیکن اب اس چمن میں طراوت نہیں رہی

ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ شیریں بہت تھی زیست
لیکن اب اس شکر میں حلاوت نہیں رہی

ہے کچھ دنوں کا ذکر کہ تھی رخ پہ آب و تاب
لیکن اب آئینہ میں وہ طلعت نہیں رہی

گفتار میں مزہ ہے نہ رفتار میں ادا
باقی وہ بول چال میں لذت نہیں رہی

اب یہ فروتنی ہے تواضع یہ انکسار
وہ تمکنت وہ شان وہ شوکت نہیں رہی

لبریز ہو چکا ہے جو پیمانہ عمر کا
جام شراب ناب پہ رغبت نہیں رہی

جاتا رہا شباب رہا غم شباب کا
باقی رہا عذاب قیامت نہیں رہی

بالیں پہ آکے ناز سے کہتی ہے یہ اجل
کیوں اب تو سچ کہو کوئی حسرت نہیں رہی

بولی یہ روح قالب خاکی کو چھوڑ کر
دامن پہ گرد وادی غربت نہیں رہی

ان ابروؤں سے راہ حقیقت ملی مجھے
اب دو کمان کی مسافت نہیں رہی

خلوت میں چھپ رہا تھا جو [illegible] خودی کو چھوڑ
خلوت میں [illegible] نہیں رہی

کیا خوف کاتبانِ عمل کا بہار میں
ساقی وہ رت بدل گئی پیمانے بدل گئے

جب دل پہ رکھ لیا نہ رکیں گے کسی طرح
پتھر کو ہم سا سامنے آئے تو ٹل گئے

رہتے تھے جو سدا پیے خود لق سے قصر میں
لے کر لحد میں ساتھ نہ اپنے محل گئے

عمریں جنھوں نے گوشۂ عزلت میں کاٹ دیں
بیٹھے ہی بیٹھے وہ تو بڑی چال چل گئے

کس نے یہ کہہ دیا مرے ماتم میں رویئے
نرگس کے پھول دشت لگا کے کھل گئے

مقتل ہے اہلِ درد کا کوچے زیرِ بام
دیکھی جو اک جھلک تو کلیجے مسل گئے

اے نظمؔ عشق اور ہوس میں یہ فرق ہے
بیمار تیرے ساتھ کے اکثر سنبھل گئے

٤٩ ——— ١٧

دل اس کے سامنے ہے وہ ہے دل کے سامنے
پردہ جو ہے تو آنکھ کے اک تل کے سامنے

بیٹھے ہیں ہم حسینوں کی محفل کے سامنے
کوئی تو آئے کاکلِ مشکل کے سامنے

ٹھہرا جنازہ گور کی منزل کے سامنے
کشتی بس اب پہنچ گئی ساحل کے سامنے

ہو گی مجھی پہ تیغ لگانے کی ابتدا
پہلے پہل چلا ہوں میں قاتل کے سامنے

اچھے رہے وہ راہِ وفا میں جو مر مٹے
پھیلائے پاؤں سوتے ہیں منزل کے سامنے

غنچہ کا دل بھی آہ سے خالی نہ تھا مگر
سنتا ہے کون شورِ عنادل کے سامنے

تیغِ نگاہ ایک خریدار سیکڑوں
چھریاں چلیں گی دیکھنا قاتل کے سامنے

ہم خاک ہو کے بھی نہ رکے راہِ شوق میں
آ پہنچے اور ٹھٹکے منزل کے سامنے

دیکھا رگِ سحاب میں بجلی کا اضطراب
اک نبضِ ناتواں تپشِ دل کے سامنے

شرطِ وفا کا پاس رہے کشتگانِ عشق
تیوری چڑھی ہے نہ خنجرِ قاتل کے سامنے

قبلہ کے رخ گیا ہے لبوں تک پہنچ کے دم
الٹی چلی نہ سانس بھی منزل کے سامنے

کیسی نگاہِ یاس نے تصویر کھینچ لی
قاتل کا منہ اتر گیا بسمل کے سامنے

بھولے ہوئے کو یاد دلانے سے فائدہ
کیوں دل کا نام لیتے ہو بیدل کے سامنے

اے ساربانِ ناقۂ سلمیٰ ہوش باش
اڑ اڑ کے خاک آتی ہے محمل کے سامنے

میری نظر اٹھی یہ جو کھلوا دیا تجھے
گستاخیاں بھری ہوئی محفل کے سامنے

ابرو کا حسن دیکھتے ہی چھپ گیا ہلال
ٹھہرا گیا نہ مدِ مقابل کے سامنے

اے نظم تجھ سے پوچھ دلِ قیس کی خبر
دیکھا تھا تو نے کسی محمل کے سامنے

۱۵۰ — ۲۴

نشہ میں سوجھتی ہے مجھے دور دور کی
ندی وہ سامنے ہے شرابِ طہور کی

خدمت ہی ٹھیک باقی گلشن طیور کی
ایذا میں عندلیب کو سطریں ہیں بور کی

ہنگامہ وعظ عشوہ گری بے سبب نہیں
واعظ ترے خیال میں چتون ہے حور کی

ان زاہدانِ خشک کو حصہ اگر ملا
مٹی ہوئی خراب شرابِ طہور کی

میدانِ حشر میں مرے نالوں کے سامنے
بیٹھی ہوئی نکلتی ہے آواز صور کی

تنکہ ہوا یہ تختِ سلیماں ہوا اڑ گیا
کافی ہے ذرہ چھاؤں ہما بال طیور کی

اے نظم دیکھ لیجئے گا ہم جو کہتے ہیں
پھر اس سے بات آپ کی اور ضد کی

۱۵۱ —————— ۱۹

دل میں شرارت اونکو سمائی ہوئی سی ہے — کچھ آگ دشمنوں کی لگائی ہوئی سی ہے
صورت عتاب کی یہ بنائی ہوئی سی ہے — او حیلہ جو ہنسی تجھے آئی ہوئی سی ہے
باد صبا یہ چال اوڑائی ہوئی سی ہے — ساری ادا کسی کی سکھائی ہوئی سی ہے
ہستی کا شور تو ہے مگر اعتبار کیا — جھوٹی خبر کسی کی اوڑائی ہوئی سی ہے
میں کس طرح فلک کے ستم کا گلہ کروں — یہ چال تو کسی کی سکھائی ہوئی سی ہے
شاہان سرفراز کا اتنا تو ہے نشان — کچھ گرد آسمان تک چھائی ہوئی سی ہے
دلکش کچھ اس طرح کی صدائے الست تھی — کانوں میں آج تک جو سمائی ہوئی سی ہے
منزل اوسے سمجھ کے گھر کھوتے ہیں ہم — بستی جو رہزنوں کی بسائی ہوئی سی ہے
پہلے تو اضطراب نہ تھا دل کو اس قدر — بجلی یہ آسماں کی گرائی ہوئی سی ہے
رنگیں ہے میرے قتل سے دامن بھی یار کا — تلوار بھی لہو میں نہائی ہوئی سی ہے
ہچکی نہ ہائے کشتہ شمشیر ناز نے — افعی کے زہر میں یہ بجھائی ہوئی سی ہے
آمد سے ظلمت شب ہجراں کی دن ہے آج — تاریکی آفتاب پہ چھائی ہوئی سی ہے
جلسہ تو ہوگا عید میں دور شراب کا — سرخی ابھی سے چہرے پہ چھائی ہوئی سی ہے
اس بت کی دید کو نظر پاک ہیں ہے شرط — اے نظم آنکھ آئینہ کی لگائی ہوئی سی ہے

نالے اسی طرف ہیں رواں آہ اسی طرف
جان حزیں فلک کی ستائی ہوئی سی ہے

زلفیں بھی حلقہ حلقہ ہیں کاکل بھی پیچ پیچ
آنکھوں میں وہ پری دل میں سمائی ہوئی سی ہے

فصل بہار آ گئی اک جام پیتے ہی
ساقی گھٹا کچھ آنکھوں میں چھائی ہوئی سی ہے

سمجھو اسے بنے ہوئے شاعر کا ہے کلام
جس شعر میں کہ بات بنائی ہوئی سی ہے

آساں ہے نظم ترک ملاقات خلق سے
لیکن پری یہ دل میں سمائی ہوئی سی ہے

۱۵۲ —————— ۱۰

تنہا نہیں ہوں گر دل دیوانہ ساتھ ہے
وہ رہ گزر ہوں کہ پریخانہ ساتھ ہے

ہنگامہ اک پری کی سواری کا دیکھنا
کیا دھوم ہے کہ سینکڑوں دیوانہ ساتھ ہے

دلمیں ہیں لاکھ طرح کے حیلے بھرے ہوئے
پھر مشورہ کو آئینہ و شانہ ساتھ ہے

روز سیہ میں ساتھ کوئی دے تو جانیے
جب تک فروغ شمع ہے پروانہ ساتھ ہے

دیتا نہیں ہے ساتھ تہی دست کا کوئی
جب تک کہ مے ہے شیشہ میں پیمانہ ساتھ ہے

سیکھا ہوں میکدہ میں طریق فروتنی
جب تک کہ سر ہے سجدۂ شکرانہ ساتھ ہے

جو بے بصر ہیں ڈھونڈتے پھرتے ہیں دور دور
اور ہر قدم پہ جلوۂ جانانہ ساتھ ہے

کیا خوف ہو ہمیں زن دنیا کے مکر کا
اپنی مدد کو ہمت مردانہ ساتھ ہے

غم کی کتاب ہے دل صد پارہ کم نہیں
جس بزم میں گئے یہی افسانہ ساتھ ہے

مانند گردباد ہوں خانہ بدوش میں
صحرا میں ہوں مگر مرا کاشانہ ساتھ ہے

باندھے تھیں ان کے ہاتھ لگا کر حنا کبھی
کھولے لگے تھے چھیڑ چھیڑ کے بند قبا کبھی

فریاد و آہ سے نہ مرا دل بھرا کبھی
فوراً اٹھائے درد جو میٹھا گلا کبھی

تھی ہم سے آپ سے نہ ملاقات کیا کبھی
یوں پھر گئے کہ جیسے نہ تھے آشنا کبھی

عالم کو قتل کیجئے تیر نگاہ سے
یہ ہے وہ تیر جو نہیں کرتا خطا کبھی

کعبہ میں بتکدہ میں گیا خیر ہو گئی
زاہد یہاں قبول نہ ہوتی دعا کبھی

اب اشک گرم آتے ہیں ساتھ آہ سرد کے
ایسی تھی برخلاف نہ آب و ہوا کبھی

دیکھا تھا اک نظر کہ چلا سو نگہ کے تیر
کہتا رہا کہ اب سے نہ ہوگی خطا کبھی

تھا اوسکو میرے بیچ میں دریائے آئینہ
اوس پار اس طرف کی نہ پہنچی صدا کبھی

گرداب میں جب آ گئی کشتی تو سمجھے ہم
ساحل پہ یاد ہی نہیں آیا خدا کبھی

اس بزم میں جلائے گئے ہم شمع کی طرح
نکلا زبان سے نہ برا یا بھلا کبھی

گویا کہ زخم تھا میں دل روزگار کا
رویا کبھی تو حال پہ اپنے ہنسا کبھی

بے وجہ ہو کسی کی برائی میں جو کوئی
اس کا کبھی اس جہاں میں نہ ہو گا بھلا کبھی

زانو پہ بارہا تھا کہ پتھر سے پھوڑ سر
مٹتا نہیں نصیب کا غافل لکھا کبھی

ظلمات میں تو جائے نکل آئے تجھے خضر
کوچہ میں زلف کے نہ ملے گا پتا کبھی

چشمے کبھی بہائے ہیں [illegible]
میرا قلم عصا تھا کبھی اژدہا کبھی

کیا طرفہ عاریت نفس مستعار ہے
جس کی بقا کا آمد و شد پر مدار ہے

چرخ کوکب ایک خود شرار ہے
ہستی سے جو کنایہ عدم بے قرار ہے

چھوڑے نہ راستی کا کبھی راستہ بشر
ہونے دے گر عدو فلک کج مدار ہے

پتھر میں گھر بنایا ہے تو نے جو اے شرار
آخر ثبات عمر بھی کچھ پائدار ہے

ہے یہ صدائے شکست میں جام حباب کی
طرز طلسم یہ نفس مستعار ہے

ہونے کو اب ہے چاک گریبان کو آہ ہیں
انداز پیرہن فشانی باد بہار ہے

فکر رسا کی ہیں قدر اندازیاں عجیب
جو طائر خیال ہے اس کا شکار ہے

۵۵ —— ۱۱

نظروں سے تو نہاں وہ مثال نظر رہے
آنکھوں میں پتلیوں کی طرح جلوہ گر رہے

ہے آنکھ وہ کہ عیب پہ اپنی نظر رہے
وہ سر ہے قطرہ کہ اشک ندامت سے تر رہے

وہ دن گئے کہ دہر میں آکر اتر رہے
کہنے کو سب کہیں گے یہی عمر بھر رہے

کہتی ہے اے صبا یہی آشفتگی کی چال
تو جا کہیں سے باغ میں دم بھر ٹھہر رہے

آیا نہ کچھ جواب تو قاصد بھی آ کوئی
خط لے کے جو گئے تھے وہیں جا کے مر رہے

کیسا خیال ضبط نے ایسا کیا مجھے
نوک مژہ پہ اشک کے قطرے ٹھہر رہے

دم بھی رواں ہوا اگر افشائے راز ہو
اس کاروان آہ کا ہم سفر رہے

پڑھ لو لکھا ہے صاف خط تقدیر یار میں
ہم ہر کہیں کہ عشق کے سینہ سپر رہے

ہم نے کبھی پڑھی جو دعائے ہلال بھی
ابروئے کسی حسین کے مد نظر رہے

خورشید پر یہ خندۂ دنداں نما ہوا | شبنم کے اشکِ گل پہ جو وقتِ سحر رہے

اے نظمؔ ساتھ ہو نہ سکا اہلِ ذوق کا
جب وہ قدم اٹھا کے چلے ہم ٹھہر رہے

۱۵۶ —————— ۱۱

میں ہی رہا نہ اے شبِ عشرت نہ تو رہی | رونے کو لاش پر جو رہی آرزو رہی
وقتِ سحر نہ بزمِ طرب روبرو رہی | اک میں گرفتہ دل رہا اک آرزو رہی
سمجھو گے تم ثبات نہ ما نو گا میں کبھی | میرے تمہارے حشر پہ اب گفتگو رہی
خلوت میں آئینہ نے بھی دیکھا ترا جمال | او بیوفا رہی تو مجھے آرزو رہی
جھگڑا تمام ہو گیا پہلی نگاہ میں | اچھا ہوا کہ جان گئی آبرو رہی
دل میں مرے ہوا و ہوس کی جگہ نہ تھی | ناخواندہ میہماں کی طرح آرزو رہی
حیرت سے اپنی درسِ خموشی ملا مجھے | طوطی کو آئینہ سے اگر گفتگو رہی
عالم میں اے اجل نہ کوئی تھا رفیق یار | میں تیرے ساتھ اور مرے ساتھ تو رہی
نکلیگی تن سے روح خدا جانے کس طرح | گر وقتِ نزع کشمکشِ آرزو رہی
بخشش کا حکم ہو گیا دم اس کو رُک گیا | جب تھوڑی دیر لاش مری قبلہ رو رہی

بیجا نہ تھی یہ آمد و رفتِ نفس بھی نظمؔ
ہر ایک ذی حیات کو کچھ جستجو رہی

۱۵۷ —————— مفعول فاعلات فعولن ۱۵

خاموش ہیں فغاں سے لب آشنا نہیں ہے
اوس کارواں میں ہیں ہم جس میں درا نہیں ہے

کچھ آرزو نہیں ہے کچھ التجا نہیں ہے
پائے طلب نہیں ہے دستِ دعا نہیں ہے

بندہ ہے رند مشرب کچھ پارسا نہیں ہے
پھولوں میں بو رہے کے بوئے ریا نہیں ہے

پھینکی کمند کیونکر قمری کے آشیاں پر
سرو چمن کا طرہ اتنا رسا نہیں ہے

ہے گلبنِ شگفتہ عہدِ شباب لیکن
رنگِ بقا نہیں ہے بوئے وفا نہیں ہے

نکلے جو میرے دل سے میری نہیں تمنا
پیدا اثر ہو جس میں میری دعا نہیں ہے

کیوں تیری رہگذر میں بیمار سر نہ پٹکیں
تعویذِ دردِ سر ہے یہ نقشِ پا نہیں ہے

بلبل کو عشقِ گل میں کیا خاک لطف ہوگا
تیرِ نگہ نہیں ہے تیغِ ادا نہیں ہے

اہلِ دول نہ اتنے پھیلائیں پاؤں اپنے

یہ کارواں سرا ہے دولت سرا نہیں ہے

کیا جانے دردِ ہجراں کیا جانے آہِ سوزاں
ناصح مری طرح سے تو مبتلا نہیں ہے

یہ دل ودیعتِ حق اور معرفت سے خالی
آئینہ تو ہے لیکن اس میں جلا نہیں ہے

جاتی ہے غمزدوں کی فریاد اوپر اوپر
گنبد میں آسماں کے شاید صدا نہیں ہے

حیرت کا میری باعث جلوہ ہے خود تمہارا
تم آئینہ سے پوچھو میری خطا نہیں ہے

کہنے سے تیرے ناصح چھوڑوں میں ہرزہ گردی
تیری طرح سے میرا اُچھا سر پھرا نہیں ہے

تسلیم آج ڈھونڈنے کو اس کے چلا تھا گھر سے
کھویا گیا خود ایسا جس کا پتا نہیں ہے

۱۳

مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلات

۱۵۸

بسانِ نکہتِ گل ساتھ ہم صبا کے چلے
ہے آشنا وہ جو کہنے پہ آشنا کے چلے

فضائے دہر میں یاں ہم مثلِ برق آ کے چلے
تڑپ کے کاٹ دیا وقت مسکرا کے چلے

رواروی میں یاں ہم بس تو قافلہ والو
کہ جس کو ساتھ ہو دنیا قدم اٹھا کے چلے

نمودِ عشقِ سحری ہوا اجل آئی
چراغِ صبح تھے گویا کہ جھلملا کے چلے

نثار ہو جیے اس دل پہ جو صاحبِ درد
وہ پاؤں چومیے جادہ پہ جو وفا کے چلے

یہ کیسا حسن کا نشہ یہ بول چال ہے کیا
زبان بہک کے چلے پاؤں لڑکھڑا کے چلے

سنا ہے برق کو اک لاگ ہے بلندی سے
بشر حد سے زیادہ بھی سر اٹھا کے چلے

خدا کے واسطے اے صبر و تاب و ہوش و خرد
کہاں چلے کہ مجھے بے زباں بنا کے چلے

یہ دیکھنا ہو کسی دل کی لاش اور میں ہوں
خبر نہیں ہے مجھے وار کب اٹھا کے چلے

کبھی تو آ گئے تکیہ پہ ہم فقیروں کے
دعائیں سن کے چلے کوسنے سنا کے چلے

نظارہ جس کا ہو عالم کو مایۂ حسرت
وہ راستے میں نہ کیوں اپنا منہ چھپا کے چلے

جب اپنی آنکھ موئی بند سب کی آنکھ کھلی
جو گہری نیند میں تھے ان کو ہم جگا کے چلے

دھوئیں اڑا دیے اے نظم تیری باتوں نے
رقیب جل کے اٹھے پیچ و تاب کھا کے چلے

۱۵۹ — ۸

اگر تو آرزوی خدمت مغاں داری
بیا راز دل و دیں آنچہ ارمغاں داری

اگر درنگ و تامل کنی زیاں برتست
کہ صید بر ہدف و تیر در کماں داری

زمانہ در شفق خوں ہلال تیغ نو دید
تو آسمان و گر زیر آسماں داری

تو غیب تر ز تو حریم جاناں است
ولیک نفس خودت را تو درمیاں داری

مدہ ایں طلسم حوادث تو از چہ اعتمادی
کہ منزل آں طرف دور آسماں داری

گدائے کوچۂ محبوب راہمی زیبد | شکست طرف کلہ شوکت جہانداری

خضر بہ حالت تنہائیت وہم سوزد | چہ لطف زیست کہ اندوہ جاوداں داری

بنال نظم کہ ایں بزم میگسار الست

شراب درد تو در شیشۂ فغاں داری

۱۶۰ ——— ۱۸

کماں کی طرح جو نازک جگر نہیں رکھتے | وہ ذوق جلوۂ حسن قمر نہیں رکھتے

نہ دے سکیں گے مرا ساتھ رہروان طریق | وہ یوں قدم دم شمشیر پر نہیں رکھتے

سفینہ اپنا ہی صبر و رضا کے ساحل پر | امید و بیم کے طوفاں کا ڈر نہیں رکھتے

یہ راستی پہ تواضع جو سرو و بید میں ہے | شجر ہیں اور بھی ایسا ثمر نہیں رکھتے

مریض غم کو خوشی کیا جو ہے سحر نزدیک | کہ چارہ گر تو امید سحر نہیں رکھتے

اور اونچا ہی قدر افگن لگا کے تیر کوئی | ہوس ہے اوڑنے کی اور بال و پر نہیں رکھتے

وہ لوگ جو ہیں رہ مستقیم کے سالک | قدم ادھر نہیں رکھتے ادھر نہیں رکھتے

فروتنی نے کیا سرکشی کو یوں پامال | کہ جانتے ہیں کہ ہم تن پہ سر نہیں رکھتے

فلک نے دہ میں شب غم کے جاگنے والے | سوائے رنگ پریدہ سحر نہیں رکھتے

عزیز خلق وہی خوش نصیب ہیں جو لوگ | سر غرور و دل کینہ ور نہیں رکھتے

ستارہ ریزی شام طرب میں محو ہیں جو | نفس گداز ہی یاد سحر نہیں رکھتے

ہمیشہ لالہ کے مانند لب ہے پر خندہ | مگر شکایت داغ جگر نہیں رکھتے

دماغ اپنا بھی ہے آسمان پر لیکن — فلک کی طرح سے دوران سر نہیں رکھتے

گلوں کو بھی دل و دعویٰ ہے نغمہ سنجی کا — زبان حال کی بلبل خبر نہیں رکھتے

دکھاؤنگا اونھیں میں سلک چاک جیب شکیب — کہ زعم ہے نگہ پردہ در نہیں رکھتے

فغاں ہیں بلبل شیدا کے نشتر ہوں تو کیا — جو کوچہ رگ گل میں گذر نہیں رکھتے

فروغ بخش ہے چشم محبت احباب — شعاع مہر ہے تار نظر نہیں رکھتے

اونھیں سے حلقہ کا نظم جو عزت سخن میں
خبر کچھ اپنی بھی جو بے خبر نہیں رکھتے

۱۶۲ — ۱۷

جہان کس کا ہے عمر گریزپا کس کی — یہ چلتی چھاؤں ہے ہوتی ہے آشنا کس کی

نگاہ اس سہ لڑی دل کا غیر جال ہوا — گناہ کس نے کیا آ گئی قضا کس کی

وفور رشک سے محفل میں کہہ نہیں سکتا — لگا رہی ہے مجھے برچھیاں ادا کس کی

عدو ہے در پے جان دوست در پے دل ہے — بیان کس سے کروں جا بجا ہے میں جفا کس کی

ٹپک پڑے ہیں جو مجنوں کے ذکر پر آنسو — یہ سچ بتا تجھے یاد آ گئی وفا کس کی

مجھی پہ رکھتے ہیں الزام میرے ہی غمخوار — بگڑ گئے اسے طاقت ہے یہ بھلا کس کی

کسی طرح نہیں جاتا خیال زلف و کمر — یہ کیا ہوا لپٹ گئی مجھے پڑی بلا کس کی

وہ آ کھڑا ہوا بالین پہ اور میں اٹھ بیٹھا — کدھر کا ضعف کہاں کا مرض دوا کس کی

قدم پہ اس کے گرا سامنے ہی ناصح کے — لحاظ کیسا کہاں کا ادب حیا کس کی

ہوا بہشت کی آتی ہے جب تو ساغر مے
چھلک کے جام شراب طہور ہوتا ہے

دل اپنا آپ سے دیتا نہیں کسی کو کوئی
یہ ظلم ہوتا ہے اور بے قصور ہوتا ہے

چھپیں نہ ریزہ مینا کی طرح کیوں شرر گل
کوئی بھی نشے میں اس طرح چور ہوتا ہے

قیام کب ہے جو حاصل بجھی ہو فراوانی
ہوا پہ سایۂ بال طیور ہوتا ہے

سرائے دہر میں ہو کون آشنا کس کا
کہ صبح و شام ورود و صدور ہوتا ہے

فروتنی میں کچھ ایسی ادا نکلتی ہے
کہ انکسار پہ اپنے غرور ہوتا ہے

کیا نشیب و فراز جہاں کو جب ہموار
نہ دل میں رنج نہ پیدا سرور ہوتا ہے

نہیں علاج منافق کی روسیاہی کا
جو دل ہو صاف تو چہرے پہ نور ہوتا ہے

اودھر سے کرم پہ ہوا اصرار ہم کو عصیاں پہ
اودھر سے عفو ادھر سے قصور ہوتا ہے

کیا ہے اوس نے ہر اک سے وصال کا وعدہ
اس اشتیاق میں مرنا ضرور ہوتا ہے

سراب ہے جسے سمجھے ہوئے ہوں میں دریا
کہ جتنا بڑھتا ہوں اتنا ہی دور ہوتا ہے

جنہوں نے کھینچا ہے دامن مرا ادھر اے ظلم
ہر ایک خار جہاں نخل طور ہوتا ہے

۱۹۷

کہے سے سو ذرا پاس آ کے بیٹھ گئے
نگاہ پھیر کے تیوری چڑھا کے بیٹھ گئے

کچھ اس ادا سے چلا ہو تو اوٹھ کے محفل سے
کہ دل بھی ساتھ ترے نقش پا کے بیٹھ گئے

نگاہ یاس مری کام کر گئی اپنا
رولا کے اٹھے تھے وہ مسکرا کے بیٹھ گئے

کسی کی آہ سے پتھر تو ہو چکا پانی
کسی کے دل پہ جو اب بھی اثر نہیں نہ سہی

ترا خیال ہے اور میں ہوں اور دل بیمار
کوئی انیس کوئی چارہ گر نہیں نہ سہی

ہمارے دل میں تو ہر لحظہ ہر گھڑی ہو تم
تمہاری بزم میں اپنا گزر نہیں نہ سہی

فلک سے ہم نہیں جھکنے کے لاکھ مٹ جائیں
دماغ تو ہے وہی تاج زر نہیں نہ سہی

مزہ ہے اہل توکل کو روکھی روٹی کا
نمک نہیں نہ سہی یا شکر نہیں نہ سہی

یہی سمجھ کے سناتا ہوں درد دل اپنا
کبھی تو ہوئے گا اس کا اثر نہیں نہ سہی

مرا قلم تو جواہر اگل رہا ہے نظم
جہاں میں گر کوئی حفاظ نہیں نہ سہی

یہ نہیں سمجھا کہاں لا تو نے بزم انس سے
لے گئی یاد دشت امکاں کی طرف وحشت مجھے

دل کی محویت کا وہ عالم ابھی تک یاد ہے
آپ میں آنے کی ممکن ہی نہ تھی فرصت مجھے

مجھ کو دکھائی دیا عالم خود پرستی کا ہے دور
بیخودی رہتی ہے ہر دم [illegible] مجھے

مجھ کو منزل سے خودی کی ہے سفر تیری طرف
ہو گئی تیری جدائی کا عالم حسرت مجھے

جتنا بڑھتا ہوں میں اتنا پیچھے ہٹتا جاتا ہوں
دور کرتی ہے تجھ سے میری حیرت مجھے

آسماں میں تو نہیں ہے لامکاں میں تو نہیں
ڈھونڈ سکتا ہوں کہاں میں [illegible] مجھے

اک تماشہ ہے سرائے زیست کی سارا جہاں
ایک [illegible] حسرت مجھے

شان تیری یہ کہ بے مانگے دو عالم دے دیا
حال میرا یہ کہ اب بھی رہ گئی حسرت مجھے

ہو گئے کیا کیا ستم اب تو نہیں کچھ یاد بھی
دل تھا پہلو میں تو کرتے تھے کبھی فریاد بھی

میں تو صیدِ تازہ تھا چوکا مگر صیاد بھی
پلکیں ٹانکی تھیں تو سی دیتا لبِ فریاد بھی

تکیہ رکھتے ہیں خدا پر ہیں فقیر آزاد بھی
کم نہیں کملی سے ہم کو سایۂ شمشاد بھی

دل فریبی پر تلے ہیں سرو بھی شمشاد بھی
جاں ستانی پر کمر باندھے ہوئے صیاد بھی

میں بھی اس گلشن میں ہوں اور خانۂ صیاد بھی
نالہ وہ کھینچوں کہ جس میں برق بھی ہو یاد بھی

غم نہیں اس کا اگر میں ہو گیا برباد بھی
دل تو ہے پہلو میں اور دل میں تمہاری یاد بھی

یاد ہے شیون بھی مجھ کو نالہ بھی فریاد بھی
آپ کو مرغوب کیا ہے کچھ تو ہو ارشاد بھی

اب تو قائل ہے وفا کا وہ ستم ایجاد بھی
ظلم بھی ہے ستم بھی ہے داد بھی بیداد بھی

کم نگاہی اس قدر بے التفاتی اس قدر
اک نگہ پر ہم بکے بھی ہو گئے آزاد بھی

آنکھیں پھوٹیں اوس کی جو منکر ترے جلوہ کا ہو
دیکھتا ہے یہ کرشمے کورِ مادرزاد بھی

رشکِ یکتائی کہاں تک تا کجا قہر و غضب
خاک میں تو مل چکے نمرود بھی شداد بھی

دیکھنا اس خوابِ نوشیں کو نہ چونکے ہم ذرا
شورِ ماتم بھی رہا شورِ مبارک باد بھی

کی سوادِ شہرِ خاموشاں نے کچھ ایسی کشش
منزلوں پیچھے رہی مجھ سے مری فریاد بھی

سایۂ گلبن میں بلبل کو اترتے دیکھ کر
چال پرچھائیں کی سی چلنے لگا صیاد بھی

دل سے بھاگی ہے وفا اہلِ وفا کی اس قدر
جان دے کر مول لوں دردِ سرِ فرہاد بھی

ایک تو منزل کٹھن ہے اور پھر ہر گام پر
حادثہ پر حادثہ افتاد پر افتاد بھی

حشر میں ظالم نے یہ کہہ کر گلا گھونٹا مرا
ایک تو اپنا قصور اور اس پہ یہ فریاد بھی

میں تو اب چپ ہوں مگر اس خونِ ناحق کا گواہ
دامنِ جلّاد بھی ہے خنجرِ فولاد بھی

لوحِ دل سے نقشِ ہستی کو مٹا کر بارہا
توڑ ڈالا ہے طلسمِ عالمِ ایجاد بھی

…ے اشک و آہ پر جو باندھنوں باندھ گئے
یوں نہ اٹھا تھا کبھی طوفانِ ابر و باد بھی

سیج پر سو پھولوں کی اس نے کر دیں لیریں رات بھر
گندھ گیا تھا ہار میں شاید دلِ ناشاد بھی

… اس بوٹا سے قد پر کیوں نہ ہو زیبا تجھے
جھومتے ہیں سرو بھی اٹھلاتی ہیں شمشاد بھی

غزل خوانی نہیں اے نظم ہے صورتگری
باربد بھی محوِ حیرت ہو گیا بہزاد بھی

۱۶

پھر ہوں میں جب سے جوشِ عشق میرے دل میں ہے
زور و شورِ موج کا پیدا اثر ساحل میں ہے

ابر تر ہے یا کہ ہے مخانۂ کیف بہار

شاخ گل ہے یا کہ پیمانۂ کف ساحل میں ہے

تھی لہو کی چھینٹ باقی میرے جسم زار میں

وہ بھی کچھ تلوار میں کچھ دامن قاتل میں ہے

مر مٹے دریا تلک آ آ کے لاکھوں تشنہ لب

استخوانوں کی صدا خمیازۂ ساحل میں ہے

جان دینے کا مزہ اہل وفا سے پوچھئے

مر چکے ہیں پھر بھی مر جانے کی حسرت دل میں ہے

دیدۂ بیدار میں ہے ہو کا عالم ہر طرف

بزم ہستی خواب ہے اور دیدۂ غافل میں ہے

میں کسی سے منہ پہ رکھوں بات یہ عادت نہیں

ورنہ ہے میری زبان پر جو تمہارے دل میں ہے

کچھ نہ میں سمجھا کہ آخر میں ہوں تو یا تو ہے میں

کچھ نہیں کھلتا کہ دل تجھ میں ہے یا تو دل میں ہے

کشتنی مجھے سمجھے لگے بس [illegible] گردن پہ تیغ

یہ تو پوچھا تھا کچھ حسرت بھی تیرے دل میں ہے

ناتواں تھا میں اٹھا سکا نہ سختی راہ کی

کیا سمجھ کر جان دینے کو کہا تھا آپ نے
دیکھ کر لاشہ کو کیا جلدی پشیماں ہو گئے

دی جو گیسو میں گرہ آنچل سرک جانے لگا
جب لیا آنچل تو پھر گیسو پریشاں ہو گئے

مڑ کے دیکھا اوس نے دل سینوں میں بسمل کر دئے
منہ اودھر پھیرا تو جو بسمل تھے بے جاں ہو گئے

۱۶ ولہ ۱۷۴

دیکھنا شورش و فورِ گریۂ سرشار کی
گرد مو بیٹھی جاتی ہے گھٹا اُس پار کی

سنگِ بارانِ ستم کا ہو رہا ہے مشورہ
کرتی ہیں گردوں سے باتیں چوٹیاں کہسار کی

ہم نے وہ میدان مارا ہے کہ جس میں ہر طرف
آرزو کا خون ہے یا لاش ہے پندار کی

شش جہت ہے اک گھروندا رہ گذارِ سیل پر
جس میں گردوں ایک چلتی چھاؤں دیوار کی

سب کو قسمت نے کیا ہے لا کے [illegible]
رہنے والی ہے اجل جس گنبدِ دوار کی

جان دے کر مر کے پہنچا ساحلِ مرقد پہ میں
تحصیل کر آفت بھنور کی موج کی منجدھار کی

صفحۂ عالم پہ طومارِ شبِ غم سے ہے رقم
مہر ہے اس پر ہمارے دیدۂ بیدار کی

بند ہو کر آنکھ پھر کھلنے کی ہے کس کو امید
لوٹ لے جتنی ہے دولت دیدۂ بیدار کی

دن جو ہیں اپنے خزاں کے کچھ بھلا لگتا نہیں
یہ فضا یہ چھاؤں یہ ٹھنڈی ہوا گلزار کی

ابر کو جوشِ جنوں میں دیکھ کر کہتا تھا میں
اوڑ رہی ہیں دھجیاں کیا دامنِ کہسار کی

موج ہے آبِ گہر کی مسکرا دینا ترا
شعلۂ یاقوت ہے جنبش لبِ گفتار کی

ہاتھ میں لے آئینہ کیطرح مشتاقوں کا دل
اوس میں صورت دیکھ اپنے نخوت و پندار کی

دیکھنے کی ہیں ادائیں سیکڑوں اور اک نگاہ
لکھی ہے قسمت میں گردشِ مردمِ بیمار کی

دشتِ حیرت میں تھا سرگرداں کہ اٹھا گردِ باد

کھل گئی مجھ پر حقیقت گنبدِ دوار کی
جلوہ اس کافر کا جب دیکھا تو رکھ دی ہاتھ سے
مردم دیدہ نے سمرن آنسوؤں کے تار کی
نیم بسمل ہے نہ مرتا ہے نہ اب جیتا ہے نظم
پڑ گئی اوچھی نہ روہی ابروئے خمدار کی

۱۵ — ۱۷۵

آ کے مجھ تک کشتیٔ مے ساقیا اولٹی پھری
آج کیا ندی بہی الٹی ہوا اولٹی پھری
آتے آتے لب پہ آہِ نارسا اولٹی پھری
وہ بھی میرا ہی دبانے کو گلا اولٹی پھری
مڑ کے دیکھا اوس نے اور وار ابروں کا چل گیا
اک چھری سیدھی پھری اور اک ذرا اولٹی پھری
لا سکا نظارۂ رخسارِ روشن کی نہ تاب
جا کے آئینہ پہ چہرہ کی ضیا اولٹی پھری
راست بازوں ہی کو پیسا آسماں نے اِتدن
ولے قسمت جب پھری یہ آسیا اولٹی پھری
جو بڑا بول ایک دن بولے تجھے پیش آیا وہی

گنبدِ گردوں سے ٹکرا کر صدا الٹی پھری

رزق کھا کر غیر کی قسمت کا زنبورِ عسل
تو نے دیکھا حلق تک جا کر غذا الٹی پھری

تو ستائش گر ہے اوس کا جو ہی تیرا مدح خواں
یہ تو اے مشفق ضمیر[1] مرحبا اولٹی پھری

جس پہ آئی تھی طبیعت کی اوسی نے کچھ نہ قدر
جنسِ دل مانندِ جنسِ ناروا اولٹی پھری

یا تو کشتی ڈوبتی تھی یا چلی ساحل سے دور
وائے ناکامی پھری بھی تو ہوا اولٹی پھری

گرنے والا ہے کسی دشمن پہ کیا تیرِ شہاب
آسماں تک جا کے کیوں آہِ رسا اولٹی پھری

بچ گیا میں اوس کے آجانے سے دشمن مر گیا
دیکھ کر عیسیٰ کو بالیں پر قضا اولٹی پھری

مر گیا بے موت میں آخر اجل بھی دور سے
کوچۂ قاتل کا پتا کر گیا اولٹی پھری

---

[1] یعنی مرحبا ایک بار جیسا [illegible] ہے یا مرحبا بہ [illegible] ضمیر جوان [illegible] کی جگہ ضمیر متکلم مقصود ہے یعنی مرحبا مجھی ۱۲

ہجر کی شب مجھ کو اولٹی سانس لیتے دیکھ کر
ایک ہی دم میں وہاں جا کر صبا اولٹی پھری
ہے مرا ویرانۂ غم تنگ ایسا ہو لسنا کے
صبح [illegible] رہا اولٹی پھری

١٥ — ١٧٦

ایک دم کو حسن گل سے گلشن آرائی ہوئی
اک نظر اس باغ میں شبنم تماشائی ہوئی
صبح پیری اور غفلت اس قدر چھائی ہوئی
مسکراتی ہے سرہانے اجل آئی ہوئی
خندہ زن گل لب پہ غنچوں کے ہنسی آئی ہوئی
اے صبا کچھ تیرے چال ایسی اٹھلائی ہوئی
اک قدم ہے اندرون خانہ اک بیرون در
سانس قالب میں جو آئی بھی تو گھبرائی ہوئی
منہ سے نکلی بات اور طوفان پر طوفاں اٹھے
اشک ٹپکا اور رسوائی سی رسوائی ہوئی
شرکے میں دنیا و عقبیٰ کیطرف کیا دیکھتا
مانع وہم دو عالم تیری یکتائی ہوئی

باز آئے کب سیہ کاری سے ہم مثل قلم
مدتوں سجدے رہے برسوں جبیں سائی ہوئی

باغ عالم میں بہار زندگانی ہو تو کیا
ایک ہی دل کی کلی اور وہ بھی مرجھائی ہوئی

کج روی طینت میں ایسی ہو تو اس کا کیا علاج
راہ تو سیدھی ہے لیکن چال کترائی ہوئی

کوی رسوائی تک آنے کو نہ اوٹھا تھا قدم
دستگیر آخر کمند ناشکیبائی ہوئی

عشق کے شعلوں کو اب تو ہی بجھا لے چشم تر
یاد کر یہ آگ ہے تیری ہی بھڑکائی ہوئی

کھل گئے گل عقدہ دل ناکشودہ ہی رہا
ناخن موج صبا سے بھی نہ گیرائی ہوئی

شام سے سوز شب غم نے مجھے دکھلا دیا
شمع کے منہ پر جو دیکھی مردنی چھائی ہوئی

گنبد اک وہ بھی ہے وہم و شک کی بازیگاہ کا
بات جو مجھی ہوئی ہے یا ہے سمجھائی ہوئی

ہے وہی علت عدم کی جو ہے علت کا عدم

۱۷۷ ۳۶

باعثِ ہنگامہ اپنی ناشناسائی ہوئی

عشق میں جب تک جنوں کی کارفرمائی نہ تھی
گرمیِ ہنگامہ بازارِ رسوائی نہ تھی

شغل خود بینی تماشائے بزم آرائی نہ تھی
جلوہ گر تھا یار اور چشمِ تماشائی نہ تھی

کیا سمجھ کر دشت میں جاتا بہار آئی نہ تھی
کس طرح میں جھوم کر اوٹھتا گھٹا چھائی نہ تھی

مجھ کو آوازِ شکستِ رنگ نے رسوا کیا
ورنہ دل کی بات تو لب تک کبھی آئی نہ تھی

جنگلوں میں خاک چھانی ہے جوانی کے لیے
منزلوں گرد رمِ آہوئے صحرائی نہ تھی

لذتِ دنیا کے خمیازہ کو ہم زندوں سے پوچھ
دم نکلنے کی یہ تھی تصویر انگڑائی نہ تھی

تمہید۱۳: اپنی ناشناسائی ہنگامۂ ممکنات کا باعث ہوئی یعنی ہم خود کو نہ پہچان سکے سمجھ کر ہم بھی ہیں تو ساری کائنات کا ہونا لازم ہے ہم ناشناسائی یعنی عدم اور اک ہی اور ایک عدم کا باعث ہوا اسی طرح ممکن کے لئے عدم ترجیح ترجیح عدم کا باعث ہے

ترک لذت میں بھی کچھ دل کو مزہ ملنے لگا
ورنہ کیا مجھکو ہوس بادہ پیمائی نہ تھی

وصل کیا ہوتا کہ طبع یار تھی خلوت پسند
اور اپنے گوشۂ خاطر میں تنہائی نہ تھی

جلوۂ گل کے تھے مشتاقوں میں ہم اک عمر تک
اور نرگس کی طرح آنکھوں میں بینائی نہ تھی

کون ہوش میں یاد ہو گا آپ کو یہ اے کلیم
برق ایمن سے کسی نے آنکھ جھپکائی نہ تھی

یا تو لے سکتا نہ تھا میں سانس یا تڑپا کیا
جان تازہ تھی یہ شاید ناشکیبائی نہ تھی

چشم تر دیکھنا دامن کسی نے آج تک
رہگزار سیل میں دیوار اٹھوائی نہ تھی

سوتے سوتے شور محشر جاگ اوٹھا کس طرح
اے جنوں میں نے ابھی زنجیر کھڑکائی نہ تھی

ترک الفت کرکے نکھرا اور بھی کافر کا رنگ
دل کو حسرت ہے کہ پہلے تو یہ رعنائی نہ تھی

دیکھنا ہے سیر اگر میرے تڑپنے کی تو دیکھ

یہ نہ کہہ دینا کہ بسمل میں شکیبائی نہ تھی
ساتھ غیروں کے تھے ہم بھی دورِ ساغر میں شریک
پی رہے تھے خون اپنا بادہ پیمائی نہ تھی
اب کہیں دل سے لگی رہتی ہے تو بنتی نہیں
یوں کبھی رنگِ حنا نے آگ بھڑکائی نہ تھی
وہ تو آنکلا تھا لیکن ہو گئی کیا جلد صبح
میں نے اب تک زلف بھی چہرہ سے سرکائی نہ تھی
بات کی تو نے تنِ بیمار میں جان آ گئی
سچ بتا پھر یہ کیا تھا گر مسیحائی نہ تھی
آ گیا کیا چین تجھ کو گر کے اس کے پاؤں پر
یہ علاجِ دردِ سر تھا ناصیہ سائی نہ تھی
صورِ اسرافیل سے بس جاگنے والا نہ تھا
کیا کہیں تو نے تو آ کر قبر ٹھکرائی نہ تھی
ہم سے سچ کہہ تختِ پریوں کا نکل جانا کہاں
اتنی بھی کوتہ کمندِ ناشکیبائی نہ تھی
کشتیٔ مے پر ہے اب تختِ سلیماں کو بھی رشک
بادہ پیمائی تھی آخر باد پیمائی نہ تھی

قلزم مئے میں ہیں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے
آ گئی تھی لہر اک مستوں کی انگڑائی نہ تھی

زندگی گذری ہے کیونکر سچ بتانا اے اجل
لاکھ بار آئی تھی تو کچھ ایک بار آئی نہ تھی

ہم نے عالم میں کہیں دو دل ملے دیکھے نہیں
ان میں یکرنگی نہ تھی تو اون میں یکجائی نہ تھی

فرش استبرق بچھایا تھا نگاہِ شوق نے
حشر کے دن ہم کو فکر برہنہ پائی نہ تھی

کیوں نکل کر تو ہوا خلوت سے زیب انجمن
حسن بے پردہ تھا جب تک تو یہ رسوائی نہ تھی

کام مشکل آ پڑا تھا اور نہ تھا عزم درست
عقدہ تھا دشوار ورنہ ناخن میں گیرائی نہ تھی

پھیر لیتی ہے نگہ تصویر بھی اس شوخ کی
پوچھتا ہوں جب کہ ہم سے کیا شناسائی نہ تھی

مہرباں ہوتے غریبوں پر تو گھٹ جاتی نہ شان
کیا تم آ جاتے تو میری قدر افزائی نہ تھی

پست ہو جانے سے اپنے ہو گیا تیرا عروج

ورنہ کچھ تیری بساط لے چرخِ مینائی نہ تھی

ہم تھے ساقی تھا ہمارا میکدہ تھا جام تھا
جب زمانہ میں بنائے چرخ مینائی نہ تھی

میرے لب سے ہو گیا کیسا گلِ رخسار سُرخ
تیرے لب سے برگِ گل اس طرح شرمائی نہ تھی

راہ میں شل ہو گیا برہان و حجت کا قدم
پیروی عقلِ نادانی تھی دانائی نہ تھی

پوچھتا ہے نظم مجھ کو نرگسِ بیمار سے
کیوں چلی آئی چمن میں گر توانائی نہ تھی

۱۱ — ۱۶۸

شرم یہ کیوں یہ تبسم ہائے پنہاں کس لئے
سر پہ آنچل کس لئے منہ پر ہے داماں کس لئے

غور کر طرزِ جفا کو دیکھ اندازِ وفا
تیغ گریاں کس لئے ہے زخم خنداں کس لئے

کھول کر بندِ کفن پوچھے کوئی احباب سے
منہ چھپا کر جاتے ہیں اس گھر سے مہماں کس لئے

سر بزانوئے توکل تن بہ آغوشِ رضا

ذکر سر کس واسطے ہے فکر ساماں کس لئے

صحبت بے مغز گر اندازِ ساں ہوتی نہیں
درد سر رکھتا ہے پھر شیر نیستاں کس لئے

سن کے حرف آرزو جامہ سے کیوں باہر ہوئے
خیر ہے کچھ ہو گئے شمشیر عریاں کس لئے

منہ سے تونے کہہ دیا جو آگیا مجھ کو یقیں
جھوٹی قسمیں کس لئے ہیں عہد و پیماں کس لئے

ہو کے تائب شیخ سے بیعت بھی کر کے دیکھ لی
جا کے اب باندھوں نہ پیمانے سے پیماں کس لئے

اک نگاہِ لطف ہو اوس کی تو یہ سب ہیں نثار
جان و دل کس واسطے ہیں دین و ایماں کس لئے

خضر بھی ہیں غرق گرداب اجل میں ایکدن
اے سکندر ہے تلاش آب حیواں کس لئے

کس بہار حسن سے اے نظم تھا تو ہمکنار
چاک ہیں گل کیطرح جیب و گریباں کس لئے

مے پلا ساقی ارے فصل بہار ایسے میں ہے

آبِ حیواں دے حیات مستعار ایسے میں ہے

سچ ہے اے ناصح کہ یہ ہنگام مے نوشی نہیں
مجھ کو جلدی ہے کہ دستِ اختیار ایسے میں ہے

پھر نہ یہ عمرِ ملے گی یادِ حق کے واسطے
آنسوؤں کا پنجۂ مژگاں میں تار ایسے میں ہے

وقت ہے صیدِ رمیدہ جا کے آنیکا نہیں
وار کرنا ہو تو کر زور پر شکار ایسے میں ہے

بعد اس کے پھر گلے سے بھی ملا قاتل تو کیا
پھیر دے آکر چھری دل بے قرار ایسے میں ہے

دیکھ تو حیدر کوئی دم ابھی ہے پرسان حال
چند ساعت اور ابھی روز شمار ایسے میں ہے

۱۸ ۱۸۰

سنگ پانی ہونے کو بانی ہوا ہولنے کو ہے
دیکھ اے منکر یونہی دنیا فنا ہونے کو ہے

پرسشِ اہلِ گنہ روزِ جزا ہونے کو ہے
گرمیٔ بازارِ جنسِ ناروا ہونے کو ہے

اپنی بے صبری سے عکس مدعا ہونیکو ہے

آسینہ دار اثر دست دعا ہونیکو ہے
دل وہی دل ہے جو اس کا مبتلا ہونیکو ہے
جان ہے وہ جان جو اس پر فدا ہونیکو ہے
ایڑیوں تک دوش سے گیسو رسا ہونیکو ہے
بڑھتے ہی بڑھتے یہ افعی اژدہا ہونیکو ہے
قتل سے میرے پشیماں بے وفا ہونیکو ہے
اک ستم تو ہو چکا اب دوسرا ہونیکو ہے
گو سراپا مثل اخگر ہوں گرہ کچھ غم نہیں
خاک ہو جانا مرا عقدہ کشا ہونیکو ہے
بزم میں ساغر کسی کے واسطے کوئی بھرے
میں سمجھتا ہوں کہ میری ہی صلا ہونیکو ہے
شان اُس کی دیکھ کر مجھے سے تھے ہم روزالت
دولتِ کونین بے مانگے عطا ہونیکو ہے
کس طرح بازو پہ میرے ٹھہر دوں عائے چشم زخم
اوس کی سفا کی پہ شور مرحبا ہونیکو ہے
ہاتھ سے آئینہ جب رکھا تھا سمجھا تھا یہ میں
ہو چکا ہے تیز خنجر اب جفا ہونیکو ہے

سلسلہ جنبانِ وحشت ہے خیالِ خالِ رخ
دانۂ زنجیر کو نشو و نما ہونے کو ہے

یاس میں مجھ کو تسلی دے رہی ہے بیخودی
پردہ اب اوٹھنے کو ہے اب سامنا ہونیکو ہے

چپکے چپکے ظلم کرنا چھپ نہیں سکنے کا اب
ناوکِ بیداد میں پیدا صدا ہونیکو ہے

فکرِ بے جا ہے منغص کیجیے کیوں عیش کو
یہ تو ہے معلوم قسمت کا لکھا ہونیکو ہے

چل کے زنداں و گریباں کے ستم کی داد
مژدہ اے اہل جنوں محشر بپا ہونیکو ہے

آگیا ہے شرمِ عصیاں سے جو آنسو آنکھ میں
یہ کے رخساروں پہ دُرِّ بےبہا ہونیکو ہے

یہ نگارستانِ ہستی مظہرِ قدرت سہی
نقش ہو گر آبِ حیواں پر فنا ہونے کو ہے

۱۵ — ولہ — ۱۸۱

لہر میں دریائے ہستی کی حباب آنیکو ہے
جو کوئی آنیکو ہے پا در رکاب آنیکو ہے

حسن کی آئینہ داری کو شباب آنیکو ہے
زلف میں بل گیسوؤں میں پیچ و تاب آنیکو ہے
مژدہ اے دل پھر ہوائے انقلاب آنیکو ہے
دور گردوں ہو چکا دور شراب آنیکو ہے
آنکھ میں تیری مروت بھول کر آتی نہیں
شرم سو بار آنے کو حجاب آنیکو ہے
کہہ دیا بس۔ فال بد منہ سے نہ اُو لغو نکال
مجھ پہ رحمت اُو ترے گی تجھ پر عذاب آنیکو ہے
جا چکی تاب و تواں بس اب ہے اتنا انتظار
زندگانی کیطرف سے بھی جواب آنیکو ہے
پتلیاں پتھرا چلی ہیں کہتے کرتے انتظار
چارہ گر خوش ہیں کہ اب آنکھوں میں خواب آنیکو ہے
دیکھئے کیا رنگ ہو محفل کا اہل مصر کی
ہاتھ میں چھریاں ہیں یوسف بے نقاب آنیکو ہے
ہجر کی اک شب میں گھڑیاں تک چکی ہیں دو ہزار
اے فلک تجھوں لگا میں رو بہ حساب آنیکو ہے
سونے والو وقت آخر ہو گیا اب تو اٹھو

لے کے آئینہ لبِ بام آفتاب آئینکو ہے
شیشہ توبہ نہ جوشِ کشمکش میں ٹوٹ جائے
جھوم کر صحنِ گلستان میں سحاب آئینکو ہے
آ گئی عارض پہ سرخی ہر طرح سے ہے ستم
یا حجاب آئینکو ہے یا اب عتاب آئینکو ہے
خانہ دل سے اوٹھائیں اپنا بستر صبر و ہوش
اس سرا میں کاروانِ اضطراب آئینکو ہے
جوشِ گل کی کشمکش میں آ گیا سبزہ کو غش
شیشۂ شبنم میں کھنچ کھنچ کر گلاب آئینکو ہے
نظم دیکھیں مصطفیٰ کا جانشیں ہوتا ہے کون
عرش سے مسجد میں حکم سد باب آئینکو ہے

۱۶ — ولہ — ۱۸۲

جشنِ جم کا ماجرا بادِ صبا سے پوچھ لے
کیا ہوا تختِ سلیمانی ہوا سے پوچھ لے
وا اور بحشر آرزوں کا نکلنا تو کجا
جان بھی مشکل سے نکلی ہے قضا سے پوچھ لے
کشتۂ تیغِ تغافل کی نہیں تجھ کو خبر

میں بتاؤں تجھ کو تو اپنی ادا سے پوچھ لے

پوچھتا کیا ہے کسی سے دل کو دل کی ہے خبر
سارا حال اس ساغرِ گیتی نما سے پوچھ لے

دو گواہوں سے پریشانی کا میری ہے ثبوت
گر تجھے باور نہیں زلفِ دوتا سے پوچھ لے

ہر قدم پر آتی ہے شہرِ خموشاں سے صدا
خاک میں ہم مل گئے ہیں نقشِ پا سے پوچھ لے

اے جنوں لے چل کسی جنگل میں ہے جوشِ بہار
راہ مجنوں کی بن کے اس کالی گھٹا سے پوچھ لے

سہہ گیا آتش قدم کتنے یہ چھالا اس قدر
جھوٹ کیا ہے شعلۂ رنگِ حنا سے پوچھ لے

لوٹنا بھی دل کا ظالم دیکھنے کی سیر ہے
آنکھ اوٹھانے کے لئے شرم و حیا سے پوچھ لے

زالِ دنیا کے فریب و مکر سے غافل ہے تو
بے وفائی اس کی مردانِ خدا سے پوچھ لے

جوشِ مستی میں نہ آتا بے حجابانہ گذر
راہ میں آنکھیں بچھی ہیں نقشِ پا سے پوچھ لے

ہے زبانِ شمع خاموشی میں بھی صرفِ سخن
بزمِ ہستی کی خبر اہلِ فنا سے پوچھ لے
معت کا کچھ ہو گر پھرنا پڑے مثلِ ضمیر
دور کیوں جا تو خبر کو مبتدا سے پوچھ لے
منفعل ہو تو نہیں ہے اس کی رحمت میں کمی
چشمِ تر سے پوچھ لے دستِ دعا سے پوچھ لے
جس ہنر سے خود بخود عادت ہی سیکھے اوستاد سے
راستہ جو بھول جائے رہنما سے پوچھ لے
پھر شکیبائی کا دعویٰ ہو چلا ہے نظمؔ کو
پھر مزاج آکر ذرا ناز و ادا سے پوچھ لے

۱۸۳

منزلوں کو عشق کی اہلِ جنوں سے پوچھیے
حال یہ یارانِ نجدِ بے ستوں سے پوچھیے
دل کے خوں ہونے کی حالت اشکِ خونیں سے پوچھیے
جان پر کیا بن گئی سوزِ دروں سے پوچھیے
آسماں سے کیجیے باتیں ذرا بن کر غبار
وجہ بربادی کی کچھ گردونِ دوں سے پوچھیے

سن سکیں گے آپ کیونکر دل کی بیتابی کا حال
پوچھیے لیکن ذرا صبر و سکوں سے پوچھیے
سرکشی کا دیکھیے سرو و صنوبر کی ثمر
جھومنے کی وجہ شاخِ سرنگوں سے پوچھیے
دہرے مانندِ قلزم آسمان مثل حباب
تھاہ کو پھر اس کی کیا گردونِ دوں سے پوچھیے
تا بلب آتا ہے نالہ ارغنوں لیتا ہوا
وجہ بیتابی کی لذت ارغنوں سے پوچھیے

۱۴ ولہ ۱۴۸

عشق خطا سے ہے سو الفت لبِ خاموش کی
بڑھتی ہی رہتی ہے گرمی آتش خس پوش کی
ہم نے اس ساماں سے لی کوچہ قاتل کی راہ
بارِ گردن سر کیا گردن وبال دوش کی
کاسہ سر ٹھوکریں کھاتے ہوئے دیکھے وہیں
ہر قدم پر جس جگہ محفل تھی نا و نوش کی
خاکدانِ دہر کے چھٹنے کی پروا کچھ نہیں
تیرا دیوانہ نہ سمجھا گرد تھی پاپوش کی

قبر پہ آیا بھی تو شوخی سے باز آیا نہ وہ
شمع مدفن گاہ روشن کی کبھی خاموش کی

دیکھ کر پھولوں پہ شبنم ہے یہ مستوں کو گماں
رال ساغر پہ ٹپکی ہے کسی مے نوش کی

کیا کمندِ زلف کم تھی قتلِ عالم کے لئے
اوس پہ یہ طرہ ہوا الٹو از زیب دوش کی

رنج دنیا اس قدر مجھ سے رہا دست و بغل
وسعتِ عالم ہوئی تنگی مری آغوش کی

مٹ نہ جائے آسماں اک دن لہر ، ر کی طرح
اشک غم میں شوخیاں ہیں طفل بازی گوش کی

احتمال اب تو مکاں کا لامکاں پہ ہو گیا
بڑھ گئی ہے اس قدر پرواز میرے ہوش کی

جاتے ہی منبر پہ واعظ آپ سے باہر نہ ہو
الحذر اے مہرباں کچھ حد بھی ہے اس جوش کی

خط ساغر دور سے ساغر کے نکلے کس طرح
یہ نگاہ مست ہے ساقی کسی مے نوش کی

ہے بجائے خود کمالِ شوق بھی مشکل

تنگ آیا یار کا تنگی ہوئی آغوش کی
آرزوئے دل کو سن سن کر یہ فرماتے ہیں وہ
جی میں کیا اے نظمؔ ہے باتیں کرو کچھ ہوش کی

۱۸۵ فاعلاتن فاعلاتن فاعلات ۱۴

کیا کہیں کیونکر تھمے کیونکر چلے
مضطرب آئے یہاں مضطر چلے
غیر کے گھر اس طرف ہو کر چلے
مفت کا احسان مجھ پر دھر چلے
ضعف میں بھی ہو گئی طے راہ شوق
ہر جگہ گر گر کے اوٹھے اوٹھ کر چلے
کیا نگاہ آفت تھی کیا عشوہ تھا قہر
بزم میں چھریاں چلیں خنجر چلے
زیر گردوں زندگانی تھی پہاڑ
آفتیں جھیلیں مصیبت بھر چلے
ہو تواضع بھی مگر تمکیں کے ساتھ
چاہیے جھک کر ملے رک کر چلے
سندس و قاقم کی بھی پروا نہ کر
جب تک اپنا بوریا بستر چلے
کیا مزاج دہر کی اصلاح ہو
چار دن اپنی سی ہم بھی کر چلے
اس کو پھر تیغ آزمائی کا ہے شوق
کیا ہوا اگر زخم میرے بھر چلے
سوا تیا ہم سے میں سند پاک باز
جادہ تسلیم پر سا غر چلے
خاک ہو جاؤں تو پہنچوں اوڑ کے کاش
کچھ تو میرا زور گردوں پر چلے
قبر میں گھٹ گھٹ کے پورے ہو جائیں ہم
ہائے یہ ٹھنڈی ہوا باہر چلے
وہ تو دل لیتے ہی بازی لے گیا
داؤ اپنا دیکھیے کیونکر چلے

کشتیِ مے لے کے ساقی جلد آ | جھومتے دریا پہ ابرِ تر چلے

۱۸۶ ———————— ۳۱

تندیِ مے حیرت افزا ہو گئی | موجِ برقِ طورِ سینا ہو گئی
جب زبانِ حال گویا ہو گئی | بات خاموشی میں پیدا ہو گئی
دل میں اٹھی تھی ابھی اک لہر سی | آنکھ تک پہنچی تو دریا ہو گئی
عیش کی رات اس قدر کوتاہ تھی | شامِ امشب صبحِ فردا ہو گئی
دب گیا گردِ کدورت میں جو دل | دفن ساتھ اس کے تمنا ہو گئی
آتی ہے تارِ نفس سے یہ صدا | روحِ مرغِ رشتہ بر پا ہو گئی
ضبطِ گریہ مجھ کو راس آتا نہیں | پھر کھٹک آنکھوں میں پیدا ہو گئی
دل میں چپکے سے بر آیا خیال | اور خبر عالم میں افشا ہو گئی
پھر تجھے انساں کو نظر آتا نہیں | آنکھ جب محوِ تماشا ہو گئی
ہاتھ رکھتے ہی دلِ بیمار پر | مضطرب نبضِ مسیحا ہو گئی
کچھ نشاں تجھ کو ملا اے خاکِ جم | تیری دولت کس نے لی یا ہو گئی
پیرزن کے کلبۂ تاریک سے | روشنی طاقِ کسریٰ ہو گئی
چشمِ موسیٰ کو تھا ایسا شوقِ دید | اک نگہ برقِ تجلی ہو گئی
عشق کے اس شعبدہ کو دیکھنا | پھر جوان کیونکر زلیخا ہو گئی
دست و پا مارے کسی نے اب تو کیا | سر سے اونچی موجِ دریا ہو گئی

آگیا گلشن میں فرمانِ بہار
زلفِ سنبل خطِ طغرا ہو گئی

عشق بھی اک قوتِ اشرف ہے
دل سے دل میں راہ پیدا ہو گئی

دار پر کھینچو سزا اس کی یہ ہے
کیوں طبیعت ناشکیبا ہو گئی

دل میں تو نے جو چھپا رکھی ہے بات
وہ بھی چتون سے ہویدا ہو گئی

ہو گئی نانِ جویں سدِّ رمق
لیجیے آباد دنیا ہو گئی

نظم کھینچا تو نے دنیا سے جو ہاتھ
دیکھ پھر نعمت مہیا ہو گئی

۱۸۷ — ولہ — ۱۳

سبحہ ہے زنار کیوں کیسی کہی
زاہد عیار کیوں کیسی کہی

کٹ گئے اغیار کیوں کیسی کہی
چھا گئی ہر بار کیوں کیسی کہی

ہیں یہ سب اقرار جھوٹے یا نہیں
کیجیے اقرار کیوں کیسی کہی

روٹھنے سے آپ کا مطلب یہ ہے
اس کو آئے پیار کیوں کیسی کہی

کہہ دیا میں نے رہے جھوٹھ موٹ
ہو گئے بیدار کیوں کیسی کہی

ایک تو کہتے ہیں بدالحتیاں
اور پھر اصرار کیوں کیسی کہی

ناصحا یہ بحث دیوانوں کے ساتھ
عقل کی ہے مار کیوں کیسی کہی

یا خفا مجھ سے یا ذرا سی بات پر
ہو گئی بوچھار کیوں کیسی کہی

مجھ سے بیعت کر لے تو بھی واعظا
ہاتھ لانا یار کیوں کیسی کہی

سر مہ دے کر دل کے لینے کا ہی قصد | آنکھ تو کر چار کیوں کیسی کہی
جان دیدے چل کے در پر یار کے | او دل بیمار کیوں کیسی کہی
کیا ہی بگڑے ہو چتے کی بات پر | ہو گئے بیزار کیوں کیسی کہی

اب تو حیدر اور ہی کچھ رنگ ہیں
مانتا ہوں یار کیوں کیسی کہی

۱۸۸ —— فعلاتن فعلاتن فعلن فعلات —— ۱۷

ہیچ نظروں میں اگر عالم فانی ہو جائے | پھر ہی ہیچ مدانی ہمہ دانی ہو جائے
کشتی بادہ میں پیدا وہ روانی ہو جائے | رنگ بحر فلک آبی بھی پانی ہو جائے
کاش دل کش مری آشفتہ بیانی ہو جائے | درد دل تو نہ مرا اس کی کہانی ہو جائے
دل اگر رہبر اقلیم معانی ہو جائے | مرتفع بعد مکانی و زمانی ہو جائے
خسرو عشق نے تیشہ وہ عزت بخشی | سرفرہاد پہ جو تاج کیانی ہو جائے
جوش میں آئے اگر دل تو ہر اک قطرہ خوں | گرم ہنگامۂ خونابہ فشانی ہو جائے
جائے عبرت ہے کہ یوں پوچ کرے لشکر گل | جرس قافلہ اک برگ خزانی ہو جائے
آنکھ اک تشنگی شوق میں تاثیر ہے شرط | پھر جو تصویر کی طرف دیکھے پانی ہو جائے
کبھی مہدی کا ہی مذکور کبھی حشر کا ذکر | پاس واعظ کے جو بیٹھے خفقانی ہو جائے
دہن زخم ہی سے تیں کے لئے ہے دعا | اگر زیادہ تہ خنجر کی روانی ہو جائے
شکوہ حیدر جو کرا ہوں تو ملتا ہے جواب | جائے ہو جلد ہیں ختم کہانی ہو جائے

کس قدر جوش ہے واعظ کہیں ایسا تو نہ ہو
صرف لنتروں ہی پہ زور ہمہ دانی ہو جائے

گو ہر چند کبھی اور کبھی ناشنوا
دیکھ پھر نہ سماعت کی گرانی ہو جائے

رشتۂ در رشتہ جو ہے طول امل لطف ہو جب
صید اس دام میں طاؤس جوانی ہو جائے

چمنستاں میں عنادل کا ہو ایسا تو ہجوم
شاخ گل جو ہو وہ ارگن کی کمانی ہو جائے

ہاتھ میں لے کے عصا طور پہ آئے ہیں کلیم
آشکارا نہ کہیں حال شبانی ہو جائے

راہ مولیٰ میں اگر نظم کو آ جائے اجل
گرد صحرائے نجف بردِ یمانی ہو جائے

۱۸۹ ۱۲

وہ جو برہم ہیں تو بگڑی ہوئی تدبیر بھی ہے
مستعد لڑنے پہ مجھ سے مری تقدیر بھی ہے

دیکھیں اب ملتی ہے کیا داد ہمیں محشر میں
دل بھی قاتل بھی ہے پیکاں بھی ہے تیر بھی ہے

چاہے وہ قتل کرے چاہے مجھے قید کرے
سر بھی شمشیر بھی ہے پاؤں بھی زنجیر بھی ہے

منہ سے شکوہ تو میں کرتا نہیں خود دیکھ لیں آ
دل میں اک زخم بھی ہے زخم میں اک تیر بھی ہے

دل مضطر کی اسیری کے ہیں ساماں کیا کیا
زلف و کاکل بھی ہے گیسوئے گرہ گیر بھی ہے

خون ناحق کو بھلا حشر میں کرتے تو ہی
تیغ و صیاد بھی تیر اک بھی نخچیر بھی ہے

کس کو دیتا ہے خدا فتح و ظفر کس کو شکست
دیکھنا بخت جواں بھی فلک پیر بھی ہے

ہم نے ان زہد فروشوں کو بہت دیکھا ہے
کچھ حقیقت بھی ہے کچھ حیلۂ تزویر بھی ہے

لے چکے جان اشارہ ہے مژہ و ابرو سے
کشتۂ تیغ بھی ہے دل ہدف تیر بھی ہے

آئینہ رکھ کے ہے منظور اسے آرائش بھی
اسی پردہ میں مگر قتل کی تدبیر بھی ہے

نہیں کھلتا سببِ غفلتِ اہلِ عالم
نہیں معلوم کچھ اس خواب کی تعبیر بھی ہے

چاہ کر تم کو گنہگار رہا نظمِ حزیں
قابلِ قتل بھی ہے لائقِ تعزیر بھی ہے

۱۹۰ — ۱۶

لے کے ساغر سر و پا کا نہ رہا ہوش مجھے
ہو گیا دام کا خطرہ بھی فراموش مجھے
میں نے کہتے ہوئے کعبہ کو سنا ہی اکثر
بزمِ عشرت میں جو آجائے وہ ہے ساقی
کہہ رہا ہے یہی نقشِ خطِ پیمانۂ جم
کھول کر میں گرہ زلف پشیمان ہوا
عہدِ پیری میں ہوں وہ شمعِ مزارِ حسرت
دیدہ تا دل ہے پھر آج گہہ حیرانی
ہو تو ممکن تو رگِ جاں میں گرہ دے رکھو
عیش کی عمر ہے کوتاہ نہیں شک اس میں
خوف یہ ہے کہیں وا راحل کا چل جائے
الفتِ مادری آخر تھی زمیں کو مجھ سے

کر دیا فکرِ دو عالم سے سبکدوش مجھے
طبعِ رنگیں نے نہ رہنے دیا خاموش مجھے
کر دیا ہے غمِ عالم نے سیہ پوش مجھے
میں سنبھالوں اسے اتنا تو رہے ہوش مجھے
پی گئے گھول کے رندان قدح نوش مجھے
نظر آیا وہ ستمگار زرہ پوش مجھے
کہ نسیمِ سحری کر گئی خاموش مجھے
ہائے ای پیرِ مغاں آ گیا پھر ہوش مجھے
کہ تری یاد نہ ہو جائے فراموش مجھے
شبِ گیسو میں ہوئی صبحِ بناگوش مجھے
جھریاں گنتی ہیں پیری میں نہ رہا ہوش مجھے
کس محبت سے لیا کھول کے آغوش مجھے

اس کی رحمت کے میں صدقے کہ دیا ازراہ
دل افسردہ تجھے خاطر پرجوش مجھے

بادشاہی تھی گدائی در ستیا نہ کی
کہ سلیماں کی طرح لیکے اوڑا ہوش مجھے

نقش حسرت ہوں کسی نے نہ کیا پیش چشم
حرف عبرت ہوں سنایا نہ در گوش مجھے

پرسش حشر سے اے نظم بچالے گی ضرور
اوس کی درگاہ عطا پاش خطا پوش مجھے

١٩١ — ١٥

دیکھیے وہ زلف بکھرا قد رعنا دیکھیے
جس کے آگے تو خرامانی ہو وہ کیا کیا دیکھیے

کس کو وہ دیکھے ترا جو رخ زیبا دیکھے
چاند یہ دیکھ کے پھر منہ نہ کسی کا دیکھے

کوئی کب تک ان اداؤں کا تماشا دیکھے
روٹھ جانا ترا دیکھے کہ مچلنا دیکھے

خضر ناصح ہی اگر سحر بیاں ہونے دو
میں سمجھنے کا نہیں وہ مجھے سمجھا دیکھے

شکوہ ظالم کا زباں سے تو نہیں کرنے کا
میں دکھاؤں جو کوئی میرا کلیجا دیکھے

دیر سے حور ہے ساغر بکف و عشوہ نما
آنکھ جس نے تری دیکھی ہو ادھر کیا دیکھے

میری بیتابی دل کی ہوا او نہیں کیا پروا
جن نگاہوں نے دو عالم تہ و بالا دیکھے

شام ہی سے غم فرقت میں ہے مرنا جو مجھے
کیوں جیے اتنا جو طول شب یلدا دیکھے

تھا کرشمہ یہ شب عیش کی کوتاہی کا
صبح اور شام کو یوں تو کوئی یکجا دیکھے

بدمزاجی کی بھی کچھ حد ہے الٰہی توبہ
چھیڑ دے کوئی ذرا اور تماشا دیکھے

زاہد خشک کو دعوی ہے شکیبائی کا
سامنے اس بت کافر کے ذرا آ دیکھے

جس کو منظور رسائی ہو ترے کوچہ تک
پیچھے دونوں کھائے ہوا دشت کی ٹھوکر دیکھے

ہو جسے مثل حباب ایک نگہ کی فرصت
کھول کر آنکھ کو جاتی ہوئی نیند دیکھے

چاہیے دہر میں عاقبت اندیش نظر
جو کہ امروز کو آبستن فردا دیکھے

جوش گریہ ہے علاج غم دیوانۂ عشق
دل سنبھل جائے جو بہتا ہوا دریا دیکھے

۱۹۲ —— وله —— ۳۱

جلوہ کن پلکوں سے ہے ترے نظارا نہ سے
کیا کمی ہو گئی تمنا مری بر لانے سے

سرکشی نفس کی ہے باعث بیتابی دل
لہر پیدا یہ ہوئی سانپ کے بل کھانے سے

آنکھ بھی محو تماشا کہ گری اک بجلی
برق پیدا یہ ہوئی دل کے تڑپ جانے سے

عقدۂ سر حقیقت نہ ہوا حل اب تک
گتھیاں اور بھی پڑتی گئیں سلجھانے سے

قید ہستی کی گر سلسلۂ تار نفس
زندگی ہو گئی زنجیر کے کھڑکانے سے

روئے جی بھر کے پہاڑوں سے نکل کر فرہاد
فائدہ کیا سر شوریدہ کے ٹکرانے سے

تو نے دوزخ میں گرایا مجھے اے نفس پلید
شعلے اٹھنے لگے آتش کے بھڑکانے سے

دیکھ کر جلوۂ جاناں میں ہوا گم ایسا
آپ کو پا نہ سکا آپ میں بھی آنے سے

چشم بینا کو نظر آتے ہیں اسرار نہاں
پردۂ ابر میں بجلی کے چمک جانے سے

سارا عالم مری نظروں میں ہے خورشید نشاں
ذروں میں مہر کی تصویر نظر آنے سے

دیکھ اک گھڑی کا جل کی ہے زمانہ فانی
لے نجات ابدی جی کے نکل جانے سے

زیست کا لطف گیا ساتھ ولی زندہ کے
جل گیا نخل بھی اس پھول کے کملانے سے

دے چکا بندے کو اپنی دو جہاں وہ پہلے / اصل قیمت کو سمجھ لیجئے بیعانے سے

اپنی دنیا تو بنالی تھی ریاکاروں نے / مل گیا خلد بھی اللہ کو پھسلانے سے

داور حشر گنہ گاروں سے پرسش کیسی / فائدہ قصۂ پارینہ کے دہرانے سے

دوسری طرف عرش کے ہے منزل مقصود اپنی / رہ گیا میں کشش ارض میں آجانے سے

دیکھ لی دیکھ لی نیت تری ہم نے ساقی / بادہ کم ہو تو نہ کچھ جام کے چھلکانے سے

آگے تو کچھ بیاں کام نہیں ناصح کا / میں سمجھ جاؤں گا نہ تجھ کو ترے سمجھانے سے

کرسی عدل کی اصغر نے بڑھا دی توقیر / داوری گاہ عدالت میں جگہ پانے سے

اوج یہ مجلس اعلیٰ کی سفارش سے ملا / اور سلطان حق آگاہ کے فرمانے سے

داد لیتا ہوں میں اے نظم نوا سنجی کی
ابر کے جھومنے سے بحر کے لہرانے سے

۱۹۳

یاد تھے ہم کو بہت ذکر پریشانوں کے / سننے والے نہ رہے اب تو ان افسانوں کے

مسکرانے سے چھلکتے ہوئے پیمانوں کے / بزم میں کھلنے لگے پھول بھی گلدانوں کے

گردش قافلۂ نکہت گل کی سمجھا / دیکھ کر رنگ بدہ کو گلستانوں کے

آتش افروز ہوئی برق صدائے مطرب / نغمے نے بھیں شعلے میں شبستانوں کے

بار خاطر تو نہ ہو جا کہیں اے طول امل / پیس نہ جاؤں میں کہیں بوجھ سے ارمانوں کے

پتلیوں کا یہ تماشا تھا جو دیکھا ہم نے / ہاتھ پڑتے ہیں ترے سلسلہ جنبانوں کے

لذتِ نعمت سے ہوتی نہیں زحمت محسوس
ناقہ چلتا ہے ترنم پہ حدی خوانوں کے

بسملوں کو بھی تڑپتے نہیں دیکھا ایسا
چاندنی شمع کی مقتل میں ہے پروانوں کے

لے چل اے جذبۂ دل آنکھ بچا کر مجھ کو
پہرے بیٹھے ہوئے رہ جائیں نگہبانوں کے

ڈال دی بار پہ دزد نے اون پہ بھی کمند
کنگرے عرش سے اونچے تھے جن ایوانوں کے

ہیں حوادث بھی زمانہ کے وہ اعجاز رقم
نقش رہ جاتے ہیں ہر نخل میں طوفانوں کے

نخلِ آشوب سے اس عقدِ فلک کے پیچ کر
کچھ بگولے ہیں سرِ راہ بیابانوں کے

آزمانے کو جو ابنائے زمانہ کی چلا
دیو بھی مجھ کو ملے بھیس میں انسانوں کے

ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں ارباب کمال
حوصلے اور بڑھے جاتے ہیں نادانوں کے

خوانِ نعمت پہ ہجوم اہلِ ہوس کا ہے عبث
من و سلویٰ نہیں حصہ میں مگس رانوں کے

بحر موجوں سے گلا اپنا چھڑا کر نکلا
رہ گئے دام جو پھیلے تھے گریبانوں کے

چل اے بادِ مراد آگے ہے کشتی اپنی
منہ میں گرداب کے آشوب میں طوفانوں کے

کتنے معمورۂ عالم تھے کہ اب ان کی جگہ
خاک ہی خاک ہے دامن میں بیابانوں کے

اوس کی محفل میں خبر کچھ دلِ مشتاق کی نہیں
لوٹتے ساتھ ابھی دیکھا تھا ارمانوں کے

مجھ کو حیرت ہے کہ خسار تو لوٹتے ہیں
اور کھلاتے نہیں پھول کبھی کانوں کے

ہم نے بھی گوشۂ عزلت میں کئے ہیں کام
کارنامے جو نمایاں کئے ہیں میدانوں کے

ایسے دروازہ کو بس دور سے ہی اپنا سلام
جس جگہ ناز اٹھانے پڑیں دربانوں کے

ہیبتِ عدالتِ دولتِ عثمانی نے
قیصر میں لرزہ بر اندام شبستانوں کے

چاہیے عرش کے مضمون غزل میں اے نظم
ساتھ ہی اس کے مضامین پریشانوں کے

۱۹۴

مجھ کو اے یار ذرا چشم نمائی ہوتی
دل تو مل جاتے جو آنکھیں ہی لڑائی ہوتی

دے کے مے پیر مغاں نے مجھے روکا ورنہ
داور دولت کونین لٹائی ہوتی

راز سے دل کے نہ کرتا جو زباں کو آگاہ
بات جو اپنی تھی کاہے کو پرائی ہوتی

دل سے حسرت کا نکلنا تھا اگر ناممکن
ساتھ لیتی ہوئی دل کو نکل آئی ہوتی

سامنے داور محشر کے بگڑتے ہیں آپ
پہلے مجھ سے تو ذرا آنکھ ملائی ہوتی

ضبط بیتابی دل نے جو بنایا تھا حصار
ایک آنسو نے وہ دیوار گرائی ہوتی

ہو تمہیں رشک یہی جس طرح قفس میں صیاد میں ہوں
یہیں رہ جاتا تڑپ کر جو رہائی ہوتی

کوئی تدبیر جو بنتی تو بگڑ بیٹھتے
کبھی تقدیر جو لڑتی تو لڑائی ہوتی

ٹوٹ جاتی جو یہ زنجیر توانائی دست جنوں
شہر سے وادی وحشت میں کلائی ہوتی

تو نے جب گر چکے ہم ابر اب آیا بھی تو کیا
لطف جب تھا کہ گھٹا آنکھوں میں چھائی ہوتی

وضع ہم خانہ بدوشوں کی نباہی خضر
چھاونی عالم فانی میں چھائی ہوتی

اوج غیرت سے گراتی نہ اگر حرص مجھے
آسماں کو ہوس ناصیہ سائی ہوتی

رشک خورشید سکا خیر ہوئی یہ ورنہ
اس ستمگر نے ابھی آگ لگائی ہوتی

دل کے ارمان اگر تھے نہ نکلنے والے
دم نکلنے کی تو امید بر آئی ہوتی

گل نے کیا جانے سن پائی ہے کس کی آواز — کان بجتے ہیں ابھی تک وہ صدا آتی ہے

اے صبا سیرِ گلستاں میں مستانہ روی — تو ترے لیے گلِ نسریں کی انگڑائی آتی ہے

موسمِ گل میں سمجھ جامہ میں سماتا مشکل — ٹھیک آتا ہے گریبانِ قبا آتی ہے

شیفتہ ہو تو کوئی شوق تو ہو منزل کا — سیکڑوں کوس سے آوازِ درا آتی ہے

وحشتِ غربت سے ملتی ہے کہ جو ہوتا ہے خیال — سامنے حیرتِ نقشِ کفِ پا آتی ہے

منزلِ گور ہے اس دشت کی پہلی منزل — دل لیے آ جانے سے پہلے ہی قضا آتی ہے

دم جو لیتا ہے ذرا کوہ کنی میں فرہاد — جا کے شیریں اسے آواز سنا آتی ہے

خلوتِ وصل میں کیا کیجیے حیرت کس کی — آتی ہے شرم بھی تو رو بقفا آتی ہے

اس کا دم بھرتے ہیں تنگ اتنا دنیا الگ — ہر نفس میں خبرِ ارض و سما آتی ہے

خود تو مخمور ہے اوروں کو نصیحت زاہد — کچھ تجھے شرم بھی اے مردِ خدا آتی ہے

لطف جب ہے کہ برسنے لگے میخانہ پر — جھومتی قبلہ سے گھنگھور گھٹا آتی ہے

کیا عجب ہے کہ صراحی بھی کرے سجدۂ شکر — جھومتی قبلہ سے گھنگھور گھٹا آتی ہے

وہ چلا گورِ غریباں کو خدا خیر کرے — تو قیامت سرِ خاکِ شہدا آتی ہے

دل کی باتیں شبِ فرقت میں رہیں صبح تلک — اس کہانی میں کہیں نیند بھلا آتی ہے

آہ کے ساتھ نکلتا ہے جو کچھ دل کا غبار — جا کے گردوں پہ بھی وہ خاک اڑا آتی ہے

نہ کبھی عمرِ رواں الٹ کے پھر کشا رہا دل — سچ کہا ہے کہیں مٹھی میں ہوا آتی ہے

رحمتیں وادیِ غربت میں بھی تو نے بخشیں — چھاؤں پر سبزہ پہ جنگل کی ہوا آتی ہے

ہاتھ سے جو پونچھے مرے اشک کئے پاک اُس نے
لچھیاں موتیوں کی ہو گئے آنسو میرے

پاؤں پھیلائے سے نکالی تھی کہ سودا لپٹا
عشق لیلیٰ کے بچایں کے شگوفے ہوئے گھنگرو میرے

وصل کی شب میں کبھی کروٹ تو کبھی اس جانب
ڈھونڈتے ہیں کسی محبوب کو پہلو میرے

ہیں گئے پہنچ کسی پہر تھا کے باہمیں
آج شاخ گل خورشید ہیں بازو میرے

جب میں چاہوں کہ ہوئی یکدلی و ہمدردی
زور کی آنکھوں سے نکلنے لگیں آنسو میرے

جب بڑھی وحشت دعا جانب ساقی ازل
پھر گئے بادۂ مقصود سے چلو میرے

جان پہچان نہیں گوشۂ عزلت میں کوئی
روشناسوں میں ہیں آئینہ زانو میرے

دل کو تولے تو ہے حسرت دیدار ذرا
روشنی طور کی دیں سنگ ترازو میرے

آگیا حال مجھے حضرت یوسف کی طرح
آکے چمکا جو کبھی سامنے جگنو میرے

آج پر جوش ہے پر شور ہے بیتابی دل
یہ سبب ہے کہ تلاطم میں ہیں آنسو میرے

بستر غم سے کسی کروٹ نہیں پایا آرام
شکل فانوس خیالی ہے پہلو میرے

کف افسوس ہی ملا دل نے کیا کام تمام
خون امید سے لبریز ہیں چلو میرے

راز ہی کیا گرہ زلف جو کھل جائے گا
کوئی مضموں ہیں کہ بندہ جائیں گے بازو میرے

دیکھ کر تاروں کو یاد آتی ہے بزم شب عیش
صبح تک شام سے تھمتے نہیں آنسو میرے

کیا بیاں کیجئے بالوں کی سفیدی کا فروغ
عہد پیری میں ہیں نوٹے ابرو میرے

نظم اس بزم میں شاعر صاحب دل ہو
دل سے خالی نہیں مصرع کی بھی پہلو میرے

بند کی دیدۂ عشاق نے پری شیشہ میں
ایک آفت کا یہ پتلا نظر آتا ہے مجھے

سن نہ لے وہ نقش پا زمیں کی آواز
جان دیتے ہیں بھی کھٹکا نظر آتا ہے مجھے

در مقصود کا کیا خوب شگون ہاتھ آیا
کف افسوس میں چھالا نظر آتا ہے مجھے

دعوی عشق صفا اور تمہارے آگے
آئینہ آنکھ کا اندھا نظر آتا ہے مجھے

حسرت دید سے جاں آ جو گئی آنکھوں میں
دم نکلنے کا تماشا نظر آتا ہے مجھے

داغ کو گوشۂ کلیجہ سے لگائے رکھوں
ایک دل سوز توانا نظر آتا ہے مجھے

اے غم یار لہو میرا سکھانے والے
دل میں کچھ خون تمنا نظر آتا ہے مجھے

شہرۂ عشق ہے ہستی کا بیاں نام ہی نام
بیضۂ چرخ میں عنقا نظر آتا ہے مجھے

جس جگہ مہر نبوت نے شرف پایا ہے
آپ کا نقش کف پا نظر آتا ہے مجھے

ناز انداز ستم عشوہ کرشمہ حیدر
جو ہے وہ خون کا پیاسا نظر آتا ہے مجھے

۲۰۱ ——— فعلاتن فعلاتن فعلن ——— ۱۲

حسن پر خلق خدا لوٹ گئی
وہ ادا کی کہ قضا لوٹ گئی

چال پر اس کی قیامت اٹھ کر
مثل نقش کف پا لوٹ گئی

در کی طرح اٹھا میرا غبار
دو قدم چل کے ہوا لوٹ گئی

سیکھے ہم سے کوئی انداز سوال
عرش پر جا کے دعا لوٹ گئی

بعد میرے کوئی پرساں نہ ہوا
قبر پر آ کے وفا لوٹ گئی

دیکھنا وار ادا کا اوس کی — ساتھ بسمل کے قضا لوٹ گئی

وہ جو مستانہ چمن سے گذرا — شاخ گل موج صبا لوٹ گئی

دیکھنا جذب دل زار مرا — کشش کاہربا لوٹ گئی

واہ رے حسن پہ دوش و کمر — دیکھ کر زلف دوتا لوٹ گئی

چھاؤں آئی ترے کوچہ میں کہ دھوپ — خاک پر مثل ہما لوٹ گئی

چاندنی تا سر دیوار آکر — دیکھ کر جوش صفا لوٹ گئی

آج سن کر ترے نالے اے نظم
بلبل نغمہ سرا لوٹ گئی

۲۰۴ — مفاعلن فعلاتن فعولن وبار — ۲۲

خبر ہوئی خود بخود یہ دل کو دہر دار الاماں نہیں ہے
خوشی یہ کہہ کر ہوئی روانہ مرا ٹھکانا یہاں نہیں ہے

وہ عندلیب اسیر ہوں میں جسے کہ اذن فغاں نہیں ہے
قفس میں نقش قدم لگا کیا ہوں نفس ابھی تو نہ یکساں نہیں ہے

کبھی نہ کیں میں نے دل سے باتیں کہ یہ مرا راز داں نہیں ہے
نہ حرف مطلب زباں تک آیا کہ یہ مری ہمزباں نہیں ہے

یہاں سے جانے کا نام آنا فریب میں کچھ آ نہ جانا
طلسم ہے رہ گذار ہستی غبار ہر کارواں نہیں ہے

نہ جذب وہ کعبہ میں پایا نہ رنگ وہ بت خانہ میں پایا
کہاں کہاں میں نے جا کے ڈھونڈا دل و جگر کا نشاں نہیں ہے

نجانے ضبطِ فغاں نے کیونکر غمِ دروں کو چھپا کے رکھا
حریرِ رنگِ پیرہن میں تو کہیں وہ شعلہ نہاں نہیں ہے

ادھر جوانی کی شام آئی ادھر ہوئی صبحِ عہدِ پیری
یہ کیسی شام و سحر الٰہی کہ جس میں شب درمیاں نہیں ہے

نہ کوئی اعلیٰ نہ کوئی ادنیٰ کہ ہے مساوات تا ابد
جہاں کہ ہم سب ہیں رہنے والے زمیں نہیں آسماں نہیں ہے

اگرچہ ہے بے ثبات عالم ٹھہر کوئی دم تو او بہ شبنم
ترا قدم تو سبک ہے ایسا کہ برگِ گل پر گراں نہیں ہے

کمندِ فکرِ بلند سے جب فضائے خاطر کو ناپتا ہوں
تو کہتی ہے شانِ لاتناہی کہ اس کی حد لامکاں نہیں ہے

سہیل و شعریٰ و نسرِ طائر ہیں خطِ ساغر میں ڈھونڈ لینا
اگر یہ پیرِ مغاں کہے کہ یہ خط کہکشاں نہیں ہے

برا جو کہتا ہے کہہ لے واعظ برا نہ مانیں گے رند ہرگز
کسی سے دل میں ملال رکھنا یہ رسمِ دیرِ مغاں نہیں ہے

چمن میں آ کر یہ میں نے جانا ہے اتفاق اصلِ شادمانی

یہ دو ہوائیں بھی ہیں مل کر یہ نہر آبِ رواں نہیں ہے

کمندِ موجِ شعاع پا کر چلی سوئے اوجِ مہر شبنم

سپند رہ رہ گیا تڑپ کر کہ وہ دلِ بے زباں نہیں ہے

یہی تو ہے اس کا آستانہ نہیں بہت دور ہم کو جانا

وہ سامنے لامکاں نہیں ہے وہ حلقۂ کہکشاں نہیں ہے

جھلک دکھا دی تجلی کس نے اپنی کہ جوہروں میں تجلیاتِ عالم

فضائے آئینہ ہوا وہ اس میں وہ طوطی پرفشاں نہیں ہے

نہ اف کرو نگاستا کو دیکھو چھری جگر پر لگا کے دیکھو

مجھے ملالِ ستم نہیں ہے مجھے مجالِ فغاں نہیں ہے

نگاہ آبستنِ ہوس ہے ہوس ہے آلودہ مناہی

تو اس سے بہتر ہے کم نگاہی کہ کچھ تماشا یہاں نہیں ہے

بلا کی ہے لو کہ اے مسافر چلا شبِ تار میں کدھر تو

کہ غولِ صحرا کے شعبدے ہیں یہ آتشِ کارواں نہیں ہے

بھلا ہو نادان واعظوں کا کہ میکدہ کو کیا ہے رسوا

وگرنہ بادہ کشی کا چرچا کہاں نہیں تھا کہاں نہیں ہے

مقامِ تسلیم میں پہنچ کر اثر نہ خوف و رجا کا دیکھا

سنا یہ کرتے تھے واعظوں سے بہشت میں دھوپ چھاں نہیں ہے

یہ کیسی اے نظمؔ چپ لگی ہے کہیں نہ رسوا کرے یہ تجھ کو
کوئی خموشی نہ ہوگی ایسی کہ جس میں کچھ داستاں نہیں ہے

۲۰۳ — مفاعیلن مفاعیلن فعولن — ۳۲

پھرا ساقی کس آبِ آتشیں سے
کہ چھلکا خون رنگِ ساتگیں سے

یہ کاوش خارِ صحرا ور ہی پا سے
چھپا دامن تو الجھا آستیں سے

فلک شرما گیا اس کی جبیں سے
شبانے چاند زلفِ عنبریں سے

کبھی دیکھو ادھر بھی آنکھ اٹھا کر
اجازت لو نگاہِ شرمگیں سے

فلک دیتا رہا سرمایۂ وہب
نہ اپنا ہاتھ نکلا آستیں سے

کشیدہ رہ نہ یوں اے دامنِ یار
لپٹنا سیکھ زلفِ عنبریں سے

مبارک نیم بسمل ہو کے مرنا
چھری پھرتی ہو دستِ نازنیں سے

قصاص آخر لیا قاتل سے میں نے
اوسے مارا نگاہِ واپسیں سے

سفر کا میری قصہ مختصر ہے
کہیں جاتا ہوں آیا ہوں کہیں سے

بہت نازک ہے اے ناصح مرا دل
کہیں ٹوٹے نہ حرفِ دل نشیں سے

پلٹ جاتا ہے فوراً بات کہہ کر
یہ عادت سیکھ لی ہم نے نگیں سے

تپا کس خوں سے گر قہر و غضب تھا
لہو ٹپکا نگاہِ خشمگیں سے

سبب گردوں کے خم ہونے کا یہ ہے
کہ جھک کر ٹوٹتا رہ زمیں سے

شرارِ عشق دامن جھل کے بھڑکا
چراغِ عقل گل کر آستیں سے

جلائے نظم آئینہ پر اپنے
ہوئی گرد نگاہ عیب بیں سے

۲۰۴

خیالِ چشمِ فتاں ہر گھڑی ہے
لب وس کا پھول کی اک پنکھڑی ہے
چلو صحرا کو یہ دہن ہر گھڑی ہے
یہ غمزہ زلف و رخ پر یاد رکھنا
نہیں رنگِ چمن کو پائیداری
دلِ غمگیں مرا وہ کر ملا ہے
نظر کیا جانے شوخی اوس ادا کی
چلا جاتا ہوں میں غم ہو کسی کو
تب پھر تو ہے پیری ہی بری
مجھے نادر تری اس نازکی نے
وہ آکے شمع پر یالیں یہ میری
یہ جیتے ہیں کہ وہ تجھ کو تسلی
بھلا ہم اور چرا او دل کسی کا
سلے جا دیں بہشت مانگی مرادیں

۲۴

اجل سچ کہتے ہیں سر پر کھڑی ہے
گراں جس پر کہ مستی کی دھڑی ہے
یہی تدبیر مجھ کو بن پڑی ہے
کبھی کا دن کبھی کی شب بڑی ہے
یہ سمجھو فصلِ گل اک پھلجھڑی ہے
کہ لاش آرزو جس میں گڑی ہے
کہ یہ تلوار تو دل پر پڑی ہے
کوئی پوچھے کہ تجھ کو کیا پڑی ہے
غنیمت ہے جوانی جو گھڑی ہے
سمروی جب پڑی اوچھی پڑی ہے
یہ ساعت نیاسے اچھی گھڑی ہے
تمہاری دل لگی تو دو گھڑی ہے
سر اپر چھوٹے ہے اور دوہری ہے
کہ شاید دل پہ تری رحمت بڑی ہے

شہنشاہوں سے بگڑا رہتا ہے وہ
مجھے تیری فقیری بن پڑی ہے

الٰہی تو دلِ بے آرزو دے
مجھے حسرت میں حسرت یہ بڑی ہے

مرے پاس آتے آتے رک رہے وہ
اسی سے سانس سینہ میں اڑی ہے

جہالت میں سلوکِ راہِ عرفاں
اندھیری رات ہے منزل کڑی ہے

میں پہلی ہی اسیری سے تھا سمجھا
کہ بانا عاشقی کا ہتھکڑی ہے

نکالیں تو قدم وہ گھر سے باہر
قیامت ہاتھ باندھے ہی کھڑی ہے

متاعِ صبر پھونکی سوزِ غم نے
یہ چنگاری کہاں جا کر پڑی ہے

گناہوں کی گھٹا لے جائیں گے ساتھ
سنا ہے دھوپ محشر کی کڑی ہے

نہ ہو بیزار مجھ سے تو اے قبر
مری صورت گلی ہے یا سڑی ہے

وفا کہتی ہے اب تیغ پر دل جا
ادا کہتی ہے ایسی کیا پڑی ہے

ق ۲۰۵ — ۱۹

وہ آئی موجِ گل وہ برق چمکی
وہ اٹھی آتی ہے بیرق علم کی

مجھے خواہش ہے ساقی جامِ جم کی
بھلا ہو خیر تیرے دم قدم کی

یہ کہتی ہے صفِ مژگاں صنم کی
کہ راہیں بند ہیں دیر و حرم کی

تو دیکھ لے نقشِ پا اون شوخیوں کو
تری آنکھوں میں خاک اوسکے قدم کی

فلک نے کھلا رکھا ہے لالہ و گل
یہ لاشیں ہیں شہیدانِ ستم کی

سمجھ لے ہاتھ پھیلانے سے پہلے | چلیں گی برچھیاں لاؤ نعم کی
مجھے غش میں پڑا رہنا ہے بہتر | ہوا ہے گرم دامان کرم کی
ہمارے دور میں بھی ہے وہی جام | خرابی کی ہے جس نے ملک جم کی
جو میری طرح سے کھینچا دم سرد | تو سانس اکھڑی نسیم صبحدم کی
نہ کیوں قسمت پہ اپنی ہوں میں نازاں | اگر گنجائش نہیں ہے بیش و کم کی
نہ رکھنا زیست میں دم کا بھروسا | کسی نے کیا وصیت مرتے دم کی
وطن کو مڑ کے غربت میں جو دیکھا | تو اک زنجیر تھی نقش قدم کی
یہ دل ہے اور تیرے عشق کا داغ | قسم ہے مسجد کو قندیل حرم کی
عوبا چھپ جائے تو چھپ جائے لیکن | ادا چھپتی نہیں اہل کرم کی
رہائی دام گیسو سے ہوئی یوں | چھٹیں نبضیں اسیران ستم کی
وہ دل آفت زدہ وہ کوہ زلف | وہ تاریکی وہ راہیں پیچ و خم کی
گریباں تک نہ پہنچا ہاتھ اس کے | کشتیاں ہو کے بھی گردن نہ خم کی
ضرور اب اعتبار آئے گا سب کو | قسم کھائے ہیں وہ جھوٹی قسم کی

حذر لازم ہے بدگویوں کو اے نظم
کہ ہے کالی زباں میرے قلم کی

۲۰۶ —— غزل مشاعرۂ یمین السلطنۃ ذوالوزارتین دولت آصفیہ ——

چہ سامان سیہ کاری نہ کردی | ولے کردی و پنداری نہ کردی

غلامی کر کے شاہی مصر کی پائی تو کیا پائی
نہ یوسف کو مناسب تھا نکلنا چاہِ کنعاں سے
ہوا سے کھل رہے غنچے بھول یہ اجڑا دیکھا
کہ جاتے ہی تری او ٹھنے لگے شعلے گلستاں سے
تڑپ تجھ میں نہیں اے آہ گرنا دیکھ بجلی کا
اثر تجھ میں نہیں اے درد او ٹھنا سیکھ طوفاں سے
جہاں فانی ہی لیکن ہے دلیل ہستی باقی
وجود سایہ ہو جس طرح خورشید درخشاں سے
ہوا دل غم سے چور اضطراب اب بھی نہیں جاتا
بچانا شیشۂ ناموس یارب سنگ لرزاں سے
مجھے نشو و نمائے تختۂ سوسن کا شک گزرا
وہ اک پرواز تھی طاؤس کی صحنِ گلستاں سے
عجب کیا نرگسِ بیمار کی آنکھوں میں نور آئے
یہ بادل ہے کہ سرمہ او ٹھ کے آیا ہے صفاہاں سے
میں اہلِ ہوش کی اس چارہ سازی کا ہوں شیدا
بنائیں طوق اوسے گھٹتا ہو دم جس کا گریباں سے
ادب کا ہے تقاضا تھم میرے بائیں دو کوئی

انھیں خو ہے الجھ پڑنے کی ناصح کے گریباں سے

نگاہِ غور کی جس شخص نے اپنی حقیقت پہ
تو شرما کر نہ پھر اس نے اٹھایا سر گریباں سے

بسانِ سیلِ غم قطعِ تعلق کرتے رہتے ہیں
بہ شکلِ موج گر پیدا گریباں ہو گریباں سے

پلا پھر نظم کو جامِ جنوں انگیز اے ساقی
کہ دردِ سر نہو خمیازۂ چاکِ گریباں سے

۱۷ ولہ ۴۰۸

نہ اب نکلوں گا ساری عمر کوئے مے پرستاں سے
کہ دیکھی میں نے ہمدردی یہیں انساں کو انساں سے

ملا ہے گل فشانی کا سبق مجھ کو گلستاں سے
گہر ریزی مرے خامے نے سیکھی ابرِ نیساں سے

ہر اک ذرہ یہ چشمک جھانک کر روزن سے کرتا ہے
کہ میں واقف ہوں تحلیلِ شعاعِ مہرِ تاباں سے

سماں اب تک شبِ عشرت کا پھرتا ہے نگاہوں میں
نکل آنے کو تھی سلمائے فطرت خود شبستاں سے

غلط ہے اس سرا میں راحلہ ہستی کا کب ٹھہرا

مگر ہاں کچھ پتا ملتا ہے اس کا گرد جولاں سے

اثر تا عرش پہنچا اک نگاہِ حسرت آگیں کا
تلاطم پڑ گیا ہے جنبشِ دامانِ مژگاں سے

نہ ہو انسان کبھی ممنونِ منت ایسے ویسوں کا
زمیں میں گڑ گیا ہوں میں فلک کے بارِ احساں سے

کیے دیتی ہے بخیہ دیکھیے گل ہاتھوں میں رشتہ
سنبھل اے باغباں گرنے نہ پائیں پھول داماں سے

شکستِ مدعا کا سامنا ہے دونوں جانب سے
کسی کا دل ہے نازک تر کسی کے عہد و پیماں سے

رخِ روشن پہ اک خالِ سیہ میں دیکھ کر سمجھا
عروجِ ماہ میں اترا یہ تارا اوجِ کیواں سے

پتہ ملتا نہیں راتوں کو اب خوابِ رمیدہ کا
غرض کیا طالعِ بیدار کو فکرِ شبستاں سے

درِ اہلِ کرم سے راہ چلتے فیض پاتے ہیں
صبا اکثر معطر ہو کے نکلی ہے گلستاں سے

ٹھکانہ اور بھی کوئی ہے کیا خانہ بدوشوں کا
کدھر جاتا ہے دیکھیں گرد باد اُٹھ کر بیاباں سے

۲۱۰

اکیلا چھوڑ کر رخصت ہوئے سب پہلی منزل سے
خدا معلوم دو دو اشک بھی نکلے تھے کس دل سے

سنا جادو کو جل جاتے ہوئے کاجل کے بھی تل سے
نکل آیا ہو ایک تماشا فتنہ چاہِ بابل سے

اسیری میں بھی آزادی میں بھی رونا رہا ہم کو
قفس میں آئے بھی مشکل سے پھر نکلے بھی مشکل سے

ریاضت کشت زار آرزو کی سعی بے جا سے
وہی اچھے رہے کچھ ہاتھ دھو بیٹھے جو حاصل سے

فلک کی گردشیں ہیں اور جائے امن ناپیدا
بھنور میں کشتیٔ عمر رواں ہے دور ساحل سے

نہیں بحر فنا میں ڈوب مرنے کے سوا چارہ
ملا پانی نہ چلو بھر کسی پیاسے کو ساحل سے

ہزار آنکھیں فلک ہی تیرے کشتہ کی تماشائی
ستارے جھلملے ہیں آئینہ داری بسمل سے

تعلق سے جہاں کے اس طرح آزاد ہو جا تو
نکل جاتا ہے نالہ جس طرح طوق و سلاسل سے

میں اک افسردہ دل ہوں جاؤں کیونکر بزم عشرت میں
چمن میں بج رہا ہے ارغنوں صوت عنادل سے

میں اک شوریدہ سر ہوں مجھ کو لے جاؤ نہ دریا پر
نہ دیکھا جائے گا موجوں کا ٹکرانا بھی ساحل سے

شب غم میں ہوا ہے تجربہ یہ بارہا مجھ کو
اجل آتی ہے آسانی سے نیند آتی ہے مشکل سے

ذرا تو ہی بتا دے ایک دم جاؤں کہاں بیٹھوں
جدا ہو کر ترے در سے نکل کر تیری محفل سے

حدی خواں دیکھنا ایسا نہ ہو پامال ہو جائے
ہزاروں حسرتیں لپٹی ہوئی جاتے ہیں محمل سے

غبار اپنا فلک فرسا رہا شاہد ہے خود گردوں
کبھی دب کر نہیں رہتے کسی مد مقابل سے

کبھی چھوڑا نہ ہم نے شیوۂ اہل مروت کو
کبھی جھکی نہ اپنی آنکھ دشمن سے نہ قاتل سے

جو ہیں بیدار داں ان کا ذکر کیا جو چاہیں وہ سمجھیں
تراوش وجد کی بھی ہے پر افشانی بسمل سے

بڑے ہشیار ہیں اہل کرم بھی میں تو قائل ہوں

نہ قصرِ دلکشا رکھے نہ باغ جانفزا رکھے
تری جاگیر تو یہ ہے کسی کے دل میں جا رکھے
غرض اس پیر زال دہر سے کس کی بلا رکھے
نہیں میں نازکش اس کا نہ ناز لیلیٰ اوٹھا رکھے
رگ گردن پہ جس کو ناز ہو تو جھک کے مل اوس سے
یہ وار ایسا ہے جو تسمہ نہ گردن میں لگا رکھے
غم و شادی کو میں ایسا ہی سمجھا جس طرح کوئی
لگا کے خون دامن میں کہ ناخن پر حنا رکھے
وہ حاضر ہے جدھر چاہے اودھر سجدہ کرے انساں
وہ ناظر ہے جدھر چاہے اودھر دست دعا رکھے
گواہی دے رہے ہیں روز محشر دست و پا جس کے
یہ حال اپنوں کا ہے غیروں سے پھر امید کیا رکھے
یہ کہہ کر ہاتھ دیتا ہے اوٹھا یا اہل حاجت نے
مناسب ہے روا کر اس کے واسطے نہیں کچھ اوٹھا رکھے
تری سرکار سے مل تو نہایت فیض کو بیٹھا
تجھے اللہ ساری خلق کا حاجت روا رکھے

فقط دو قرص ناں ہیں نعمت خوان مہر گردوں میں
اگر کھائے تو کیا کھائے اگر رکھے تو کیا رکھے

براق آیا زمیں پر عرش سے اور عرش پر پہنچا
فلک کو رہ گئی حسرت قدم یہ بار دیا رکھے

نہ چھوڑیں گے ہم اپنی وضع گردوں لاکھ درپے ہو
اسیر قید غم رکھے گرفتار بلا رکھے

لحد میں مال و زر کچھ کام آیگا نہ منعم کے
جسے خود کھود کر گاڑا ہو امید اوس سے کیا رکھے

کسی کے کوئی کام آتا نہیں وہ وقت ایسا ہے
کہ انساں ہاتھ سے اپنے لحد اپنی بنا رکھے

جہاں میں آئے ہیں تنہا ہی اور تنہا ہی جاتا ہی
بشر کاہے کو دو دن کے لئے جھگڑا لگا رکھے

کسی کو ملک و مال آساں نہیں دیتا کبھی گردوں
اگر یوسف بھی ہو پہلے کنوئیں اوس کو چھپا رکھے

۱۱

ولہ

۲۱۲

میں ہوں بندوں میں اوسکے جو محبت کی نظر رکھے
میرا احساں عمر بھر مانوں وہ احساں عمر بھر رکھے

ہمیشہ انتظارِ آمدِ بادِ سحر رکھے
بھروسہ زیست پر مثلِ چراغِ رہگذر رکھے

یہاں جو خار ہے دامن کشِ برقِ تجلی ہے
قدم راہِ سلوک و معرفت میں دیکھ کر رکھے

جو محرم ہو نہ راہِ شوق کا اوس کو یہ مشکل ہے
نظر بھی سوچ کر ڈالے قدم بھی دیکھ کر رکھے

نزاکت راہ چلنے کو ہے مانع بات کرنے کو
حسیں ہو کر بھلا کچھ تو دہن رکھے کمر رکھے

سکھاتا ہے غرورِ حسن یوں عاشق کشی اوس کو
زمیں پر پاؤں کیوں کھوکہ وہ قدموں پہ سر رکھے

دبستانِ وفا سے پڑھ کے یہ دو حرف میں نکلا
کسی کا ہو رہے تو یا کسی کو اپنا کر رکھے

کبھی شستہ نہ ہوا اس تختۂ نرد دہر میں پھنس کر
نکل جانے کو اپنے راستہ چلنے کو گھر رکھے

صدا ہے طائرِ قبلہ نما کی پر فشانی میں
فلک دے لاکھ گردش منہ جدھر رکھے اودھر رکھے

بہت سے دل میں ہیں مضمون اٹھ اٹھ کے آتے جاتے ہیں

نہ چھپے رہتے میرے دل میں بن گئی سوز دروں وہ بھی
جہاں ہے وارِ ماتم شیوۂ گردوں سے ظاہر ہے
کہ پہنا ایک ہی خرقہ ہمیشہ نیلگوں وہ بھی
ملے دنیا بھی اور عقبیٰ بھی یہ تو ہو نہیں سکتا
کھِنچے جاتی ہے لیکن حرص میری لا یکن وہ بھی
تباہی میں کبوتر کی طرح تھا کوکب طالع
ہوا آخر ستارہ سے نحبت زبوں وہ بھی
کسی عیّار نے باتیں بنا کر لے لیا دل کو
فسانہ میں تو سمجھا تھا مگر نکلا فسوں وہ بھی
نہیں اب داد خواہی کی ہوس اے داورِ محشر
کہ میں بھی ہوں پشیماں شرم سے ہے سرنگوں وہ بھی
مجھے سوز سیہ میں سایہ اپنا یاد آتا ہے
کہ میرے ساتھ تھا آوارۂ دشتِ جنوں وہ بھی
لکھوں قصہ میں واعظ عنوانِ نوجوانی کا
حدیثِ عیش تھی سن کتھا خیر القروں وہ بھی
کوئی حرف تمنا ضبط کرتا ہوں جو اے حیدر
تو آنکھوں سے ٹپک پڑتا ہے بن کر اشکِ خوں وہ بھی

ملی تھی راہ میں منزل سراب عمر فانی کی
یہاں نقش قدم سے اپنے تونے کیا نشانی کی
صدا یہ آ رہی ہے دور سے برگ خزانی کی
کبھی ہم نے بھی لوٹی تھیں بہاریں زندگانی کی
کسی پر دل کا آنا موت تھی عہد جوانی کی
نہ بھولوں گا اسے یہ جان ہے ساری کہانی کی
کرامات صفائی قلب کو پوچھو تو شبنم سے
فروغ شمع قرباں ہے اوڑی اک بوند پانی کی
تجلی بھی ہوئی آخر تو موسیٰ نے نہ کچھ دیکھا
چکا چوندھ ایسی تھی آنکھوں میں برق لن ترانی کی
غبار راہ اٹھ کر منزل کی جانب چند گام آیا
یہ ٹھوکر پڑ گئی کس رہ نورد کاروانی کی
کوئی حد بھی ہے پستی کی ہزاروں سال جیتے رہے
تو ہم تک روشنی پہنچی ہے شعر لے بیانی کی
بگولوں میں نظر آتی ہے خاک باد گشتی
عیاں ہے برق باراں سے لڑائی آگ پانی کی

خیال آیا نہ مجھ کو حیف بعض الظن اثم کا
پشیماں ہوں کہ ناصح سے میں نے بد گمانی کی
حکومت کا مزہ ہم نے اوٹھایا ہے کہ شاہوں سے
کہ اپنے نفس سرکش پر ہمیشہ حکمرانی کی
خجالت سے خضر کا منہ چھپانا ہی مناسب ہے
کہ خواہش اور پھر وہ بھی حیات جاودانی کی
علم رکھنا نہیں گر تو قلم سے نام پیدا کر
مقام رشک ہے شہرت درفش کاویانی کی
یہ ہے نادر مرقع کارگاہ نظم کا حیدر
کہ ہیں لفظوں کے آئینہ میں تصویریں معانی کی

۱۱ — ولہ — ۲۱۵

بڑا غم ہوگا قبل عاشق ناشاد و مضطر سے
یقیں ہے تیغ قاتل خون روئے چشم جوہر سے
بھلا یا حسن دنداں سے لب نازک کی خوبی کو
بجھا دی آتش یاقوت تو نے آب گوہر سے
خرام ناز تیرا دیکھ کر ایسا عرق آیا
کہ آخر نقش سارے دھو گئے طاؤس کے پر سے

جو نازک طبع ہیں وہ سخت دل کے منہ نہیں لگتے
نہ باور ہو لڑا کر دیکھ لو شیشہ کو پتھر سے

حسینوں کی نزاکت دیکھ کر دھوکا نہ کھا جانا
کہ رخسارے تو ان کے پھول سے ہیں دل ہیں پتھر کے

خدا کے سامنے ہوگا خرام ناز کا شکوہ
گواہی دل کے پس جانے کی لینگے اہل محشر سے

اگر ان کی طرح میری پلک جھپکی ہو تو کہہ دیں
لڑائی آنکھ میں نے رات بھر ایک ایک اختر سے

کرامت تو نے رندوں کی نہیں دیکھی ہے اے زاہد
بڑھا کر ہاتھ بھر لیتے ہیں ساغر حوض کوثر سے

اثر دیکھے کوئی بیتابی دل کے مضمون میں
مرا مکتوب آگے جاتا ہے بال کبوتر سے

کسی کے شوق آرائش نے کی غارتگری کیسی
لیا اشتاق سے دل آئینہ چھینا سکندر سے

مروت نام کو تجھ میں نہیں اے برق کیا کہنا
لگا دی آشیاں میں آگ ورنہ تھی ہوا و پر سے

پری تھی آئینہ خانہ میں عکسِ حسنِ دلبر سے
صدا پرواز کی آئی پرافشانی جوہر سے

سنو تم وصفِ مے ہم سے سنا ہے نے پیمبر سے
پیمبر سن کے آئے ہیں زبانِ موجِ کوثر سے

جنوں میں سر کو ٹکرانا کبھی خالی نہ جائے گا
پری شیشہ سے اور شیشہ نکل آئیگا پتھر سے

سبک سر ہو کے جو خفت اٹھائی ہے نہ کچھ پوچھو
گیا میں ڈوبنے پانی نہ اونچا ہو سکا سر سے

کھلا جب سے کہ سب تیرے اشارے کے کرشمے ہیں
جگر کو تیر سے اک عشق ہے گردن کو خنجر سے

سنبھل کر ہر قدم راہِ فنا میں چاہیئے رکھنا
کہیں دیوار بن جائے نہ اوٹھ کر گرد ٹھوکر سے

شبِ یلدا مری آبستنِ صبحِ قیامت ہے
مجھے محشر کے فتنے جھانکتے ہیں چشمِ اختر سے

صبا نے اے گلِ تر کوئے تیرے جو آس خبر
کہا رازِ نہفتہ فاش اور ہنستا مچلا پڑے سے

سویدائے دل سوزاں سے کیا اسپند کو نسبت
کہاں ضبط تو یہ ہے دھواں اٹھے نہ مجمر سے
کبھی میں دم ہو تنگ تیز دنداں چاٹتا ہوں میں
عبث ہے فکر آب پانی تو اونچا ہو چکا سر سے
جو ہو حاصل دل روشن نہ کر لاف نسب ہرگز
صفا میں آئینہ کی فرق آ جاتا ہے جوہر سے
غنیمت کیوں نہیں سمجھو دل پر درد کو حیدر
کہ یہ دولت جو ملتی ہے تو ملتی ہے مقدر سے

۲۹ — ولہ — ۲۱۷

شب مہ میں اگر یاد آئے فلک وہ آفتاب آئے
یقیں ہے قرص مہ تک تو برق اضطراب آئے
شب غم میں کبھی پہلو نہیں ممکن کہ خواب آئے
تو کیوں کروٹ بدلوانے کو جوش اضطراب آئے
بنا کب مشک تر بالوں پہ گو رنگ خضاب آئے
نہیں ممکن جوانی کی سی رخ پر آب و تاب آئے
مروت اسے ظالم کو نہ کچھ شرم و حجاب آئے
جو کچھ کہیے تو سیدھی بات کا الٹا جواب آئے

نہ ٹھہرا تا ہوا وقت سحر کیوں آفتاب آئے

فسانہ کی عوض لے داستاں گو پڑھ کوئی افسوں

اوتر آئے پری شیشہ میں گر آنکھوں میں خواب آئے

جہاں میں سرکشی کی ہم نے اس پر بھی شرار کسا

سراپا اضطرار آئے ہمہ تن اضطراب آئے

ملانا آنکھ پھر منہ پھیر کر تیوری چڑھا لینا

یہ مطلب ہے چھری وہ لے جس کو نہ تاب آئے

ہوا ثابت یہ جب دونوں کی ہستی اعتباری ہے

نہ کیوں گردوں سے پھر آنکھیں لڑانے کو حباب آئے

نہ آئے وہ ستمگر اور بہار اس طرح سے گذرے

تڑپ کر برق سو رہ جائے گھر گھر کر سحاب آئے

نگاہِ شوق کے چلتے گیا صبر و قرار آخر

اسی رستہ سے شاید کاروانِ اضطراب آئے

نشاطِ عالم فانی ہے توام رنج و حرماں سے

سمجھئے چشم پرخوں اوس کو گر جام شراب آئے

گذرتا ہے کچھ اس انداز سے لشکر حوادث کا

کہ اوڑ کر سر پہ گردوں کے غبارِ انقلاب آئے

خدا نے کی ہی جنت و اعظوں ہی کے لئے پیدا
اگر یہ میکدہ میں بھی گئے ہو کر شاب آئے

بقدر یک نگہ مہلت نہ دی جب انتظار اوس کا
تو مشکل ہے بقدر یک مژہ آنکھوں میں خواب آئے

بہت اصرار کرنے سے اوٹھائی تو ہی آنکھ اوس نے
مگر جتنوں یہ کہتی ہے کہ آئے اور حجاب آئے

اگر سو فرتبہ آئے بہار اے آسماں تو کیا
کوئی گردش تو کر ایسی کہ پھر فصل شباب آئے

یہ راتیں ہجر کی تارے ہی گننے گننے کٹ جائیں
فلک سمجھوں گا میں تجھ سے ذرا روز حساب آئے

سوا شامِ الم کے اور کیا دیکھیں گے دنیا میں
او ٹھیں اسوقت سو کر جب لبِ بام آفتاب آئے

حذر ہے زاہد سالوس سب کو تیرے سایہ سے
اگر آئے تو ٹھہرا آتا ہوا تیر شہاب آئے

رواں ہے توسن عمر اور پڑی تھم نہیں سکتی
تو پھر کس طرح قابو میں یہ اپنے شتاب آئے

ادھر دل میں مری حسرت پہ حسرت بڑھتی جاتی ہے
اودھر شوخی پہ شوخی ہے شرارت بڑھتی جاتی ہے

زمانہ میں نہ لیگا نام کوئی عشق بازی کا
ہمارا سانحہ سن سن کے عبرت بڑھتی جاتی ہے

الٰہی دل سے یار کا اک آتش ہے پہلو میں
جو سوزش گھٹتی ہے گرد کدورت بڑھتی جاتی ہے

وہ نہیں اٹھتے اگر پہ شوق گھر سے بچے جانے کی
سحر کے ساتھ چہرے کی بشاشت بڑھتی جاتی ہے

جدائی میں مرا مثل چراغ دیدہ کا عالم ہے
کہ رونق گھٹتی جاتی ہے نقاہت بڑھتی جاتی ہے

ہرے ہوتے جاتے ہیں لالے کے تختے کوہ کا دامن
گھٹا کے ساتھ گلزاروں کی وسعت بڑھتی جاتی ہے

اٹھا کرتی ہیں گھڑیوں کے بدلے میرے نالوں کی
کہ جوں جوں رات جاتی ہے شکایت بڑھتی جاتی ہے

نہ پوچھو ہجر کی شب دم نکلنے میں ہے کیا لذت
چلی آتی ہے ہچکی نیند غفلت بڑھتی جاتی ہے

بہار گل میں ہے طاؤس آتشباز کا عالم

چمن میں پھول پھولوں میں شرارت بڑھتی جاتی ہے

زمین شعر سے کیونکر اوٹھاؤں میں قلم اپنا
کہ مثل نیشکر اس کی حلاوت بڑھتی جاتی ہے

نظر آتا ہے صحرا صاف مجھے بیٹھے زنداں میں
ہوا کی موسم گل میں لطافت بڑھتی جاتی ہے

یہاں درگاہ میں ہر روز چلّے باندھے جاتے ہیں
وہاں نام خدا ہر ایک منت بڑھتی جاتی ہے

بناؤں کا پھیکا کھیا بہار آئی نہ مہکی جب تک
مبارک ہو انہیں مہندی کی رنگت بڑھتی جاتی ہے

بہار آئی ہے کاٹے کھاتی ہے زنجیر زنداں میں
گریباں نے گلا گھونٹا ہے وحشت بڑھتی جاتی ہے

گلے سے میرے وہ خود آبدیدہ ہو کے لپٹے ہیں
تجمل میں اگلی باتوں پر ندامت بڑھتی جاتی ہے

مسلمانوں کے اوس کافر ادا سے خون ہوتے ہیں
زمین کربلا کی روز قیمت بڑھتی جاتی ہے

سمجھ کر ہم کو اپنا شیفتہ اللہ رے ناز ان کے
جو عاشق تھیں ہوا ان پر نخوت بڑھتی جاتی ہے

پتا حیدر کا وہ دو دن نہیں ملتا احباب کو
نجانے کس پہ یہ روپے محبت بڑھتی جاتی ہے

۲۰ ولہ ۲۱۹

بیان سوز غم کا جس کو اک طومار ہوتا ہے
کلیجہ اوس کا کٹ جاتا ہے جو غمخوار ہوتا ہے

اوسی پر حضرت واعظ کو کچھ اصرار ہوتا ہے
جو افسانہ بعید از عقل و دور از کار ہوتا ہے

دئے جاتے ہو غیروں کو تم ساغر دئے جاؤ
عنایت مجھ پہ کیوں ہے مجھ سے کیوں اصرار ہوتا ہے

گواہی دیتی ہے چہرہ کی سرخی دیکھ لے ساقی
کہ شرمندہ ترے احسان سے میخوار ہوتا ہے

خطا کرتا نہیں گردوں سے جو تیر قضا آیا
نجانے کس کی چٹکی میں کب سوفار ہوتا ہے

ستم کا تیرے میرے آسماں شکوہ نہیں کرتا
ترے ناوک میں انداز نگاہ یار ہوتا ہے

اوسی دن سے ہوا ہے برق تجلی منتظر تیرا
کہ دیکھا میں نے گلشن میں فروزاں خار ہوتا ہے

تڑپنے لوٹنے کا تھا مزہ عہد جوانی تک
گئی فصل جنوں اب دردِ دل بیکار ہوتا ہے
مجھے ظلِ ہما کی آرزو ہرگز نہیں ہوتی
میرے سر پر جب اوس کا سایۂ دیوار ہوتا ہے
مژہ اس راستی پر بھی رلا کرتی ہے کج مجھ سے
شکایت اوس کی کیا ابرو تو پھر خمدار ہوتا ہے
عیاں میں کامیابی ہے کرشمہ جوشِ ہمت کا
اگر یہ لہر آجاتی ہے بیڑا پار ہوتا ہے
ہوا و ابر و بحر و بر یہ سب تیرے خزانے میں
وہ مل جاتا ہے فوراً جو مجھے درکار ہوتا ہے
تجھے دشوار سا دشوار بھی آساں سے آساں ہے
مجھے آسان سے آسان بھی دشوار ہوتا ہے
اگر دنیا سے استغنا ہو مر رہنا بھی ہے آساں
ہوس ہو گر تو جینا بھی بہت دشوار ہوتا ہے
کھلا یہ رمز تابِ آفتاب و شبنمستاں سے
ٹھہر سکتی نہیں آنکھیں ہی جب بیدار ہوتا ہے
گذرگاہِ فنا میں یہ تماشا دیکھتا ہوں میں

کہ تھم جاتا ہے گرد دریا رواں کہسار ہوتا ہے
قضا کس آئینہ خانہ میں دوڑاتی ہوئی لائی
بشر کو سانس لینا بھی یہاں دشوار ہوتا ہے
حذر اے آسماں ناکام مرادوں کے ستانے سے
اولجھ پڑتا ہے وہ جو زیست سے بیزار ہوتا ہے
صفائے دل کو ساتھ اپنے لئے جاتا ہوں مرقد میں
کہیں اب حشر تک میلا کفن کا تار ہوتا ہے
رسائی چاہتا ہوں نظم اپنی کعبۂ دل تک
تو پہلے نذر بتخانۂ پندار ہوتا ہے

۲۲۰

بچھا دینگے غزالان حرم اپنا چرم پہلے
وہ پھینکیں تو کمند طرۂ زلف رسا پہلے
طبیعت میں کہاں تھا خود پرستی کا مزہ پہلے
بھلا آئینہ کب تھا قبلۂ ناز و ادا پہلے
نہ تھے ہم پیش ازیں آگاہ حال عشق بازی سے
نہ تھا معلوم دل آتا ہے پہلے یا قضا پہلے
ہوئی ہے صبح کیا جلد آج کی شب وہ جو مہماں ہیں

وہی یہ رات ہے جس کی نہ تھی کچھ انتہا پہلے

بہار آئی ابھی میں نغمۂ بلبل نہیں سنتا

مبارکباد کی دے شیشۂ تو یہ صدا پہلے

سنانے کوئی چلا نکلے ہو عیش کا ساماں

گلے کا ہار ٹوٹے پہلے اپنی قبا پہلے

خدا نے خیر کی منہ کیا دکھاتا تیرہ بختی کو

سر بالیں تربت شمع سے آئی ہوا پہلے

شب فرقت میں کی اس رشک عیسیٰ نے مسیحائی

سحر کی دے گئی مجھ کو خبر باد صبا پہلے

مجھے اب تک نہیں بھولا تصور دست رنگیں کا

تمہارے ہاتھ دبا تا رہا رنگ حنا پہلے

تہیا ہے جنوں اپنا بھی ہے کوہ و بیاباں کا

چلے ہم بھی نکل جانے دو یہ کالی گھٹا پہلے

جواب فسوں طرازی گر اس کا ہو نہ اُس کا ہے

قلم ٹوٹے مرا پہلے کہ موسیٰ کا عصا پہلے

زمیں سے کس طرح احباب کے تھمنے سے میں اٹھوں

اٹھا جائیے اُدھر بے وفا کا نقش پا پہلے

اوٹھتی ہے نسیم صبح آنچل روئے روشن سے
چھپا لے مطلع خورشید تاباں کو گھٹا پہلے

انھیں متابیوں نے اس کے کوچہ سے نکلوایا
کہ جاتے ہی اوٹھایا پردۂ دولت سرا پہلے

زباں تک بھی پہنچنا ضعف سے دشوار ہے اب تو
نکل جاتی تھی دور و دیر تک آہِ رسا پہلے

وہ کوٹھے پر چڑھیں گے برق باراں کے تماشے کو
الٰہی غیر کی آنکھوں میں چھا جائے گھٹا پہلے

خضر کیا جانیں کیا لذت ہے مرنے میں حسینوں پر
پشیمانی اوٹھائی ہے لیا آب بقا پہلے

برا ہوتا ہے دشمن کا ساتھ والو نکے بچھڑنے کا
کبھی سننے میں آتی تھی نہ فریاد درا پہلے

سما سکتا نہیں اب پیرہن میں حسن روز افزوں
نہ یوں ہر روز ٹوٹا کرتے تھے بند قبا پہلے

شکایت کیسی اولی باتیں کرنا پڑیں آخر
یہ شوخی دیکھے خود ہو گئے ہم سے خفا پہلے

حجاب آئے اُسے کیونکر نہ شبنم کے دوپٹہ میں

کسی کی آنکھ پڑتی تھی نہ حیدر رہا بجا سے پہلے

۲۲۱ — ولہ — ۱۲

اوڑا کر کاگ شیشہ سے گلگوں نکلتی ہے
شرابی جمع ہیں میخانہ میں ٹوپی اوچھلتی ہے
بہارِ میکشی آئی چمن کی رت بدلتی ہے
گھٹا مستانہ اوٹھتی ہی ہوا مستانہ چلتی ہے
زِ خود رفتہ طبیعت کب سنبھالے سے سنبھلتی ہے
نہ بن آتی ہے ناصح سے نہ کچھ واعظ کی چلتی ہے
یہ کس کی ہے تمنا چٹکیاں لیتی ہے جو دل میں
یہ کس کی آرزو ہے جو کلیجہ کو مسلتی ہے
وہ دیوانہ ہی جو اس فصل میں فصدیں نہ کھلوائے
رگِ ہر شاخِ گل سے خون کی ندی اوبلتی ہے
سحر ہوتے ہی دم نکلا غش آتے ہی اجل آئی
کہاں ہوں میں نسیم صبح پنکھا کس کو جھلتی ہے
تمتع ایک کا ہی ایک کے نقصاں سے عالم میں
کہ سایہ پھیلتا جاتا ہی جوں جوں دھوپ ڈھلتی ہے
تبارکھی ہی غم پر زیست کی یہ ہو گیا ثابت

نہ لپکا آہ کا چھوٹے گا جب تک سانس چلتی ہے

قرار اک دم نہیں آتا ہے خونِ بے گنہ پی کر
کہ اب تو خود بخود تلوار رہ رہ کر اُگلتی ہے

جہنم کی نہ آنچ آئے گی میخوار دل پہ او واعظ
شراب آلودہ ہو جو شے وہ کب آتش میں جلتی ہے

نہ دکھلانا الٰہی ایک آفت ہے شبِ فرقت
نہ جو کاٹے سے کٹتی ہے نہ جو ٹالے سے ٹلتی ہے

یہ اچھا شغل وحشت میں نکالا تو نے اے تیمار
گریباں میں الجھنے سے طبیعت تو بہلتی ہے

۲۱ —— فاعیل مفاعیل مفاعیل فعیل —— ۲۲۲

ہے دل کو یہ منظور کہ چھپ جائے نظر سے
گیسو کا ارادہ ہے کہ بڑھ جائے کمر سے

آنکھوں میں تو رہتے تھے وہ اوجھل ہوں نظر سے
پوچھے یہ کوئی چاہنے والے کے جگر سے

آثار ہیں گر برہمیِ طبع کے ظاہر
اغماض ہے انداز سے تیور سے نظر سے

کٹ جاتی ہے آخر شبِ غم ہو کہ شبِ عیش

ہوتی نہیں کچھ رات سوا چار پہر سے
ہر اک حرکت کے لئے اک روز سکوں ہے

رفتارِ فلک کم نہیں پروازِ شرر سے
ہم بھی ہیں کھنچے سرد جو رہتا ہے کشیدہ

سایہ کے بھی طالب نہ ہوئے ایسے شہرت
میں عکس ہوں اور آئینہ ہے گوشۂ عزلت

صورت نہ دکھاؤں گا جو نکلا کہیں گھر سے
ہو جاتا ہے رخسارِ کدیور کا وہ غازہ

گلزار میں جو رنگ ٹپکتا ہے شرر سے
پائی نہ خبر قافلۂ عمرِ رواں کی

پھر آئے پلٹ کر یہ مسافر نہ سفر سے
سو حیف تجھے میں نہ دکھا ایک بھی منہ پر

شکوہ مجھے رہ جائیگا یہ اہلِ ہنر سے
انساں وہی انساں ہے جو مشتاق ہوا اس کا

کانوں سے سنا جس کو نہ دیکھا ہو نظر سے
اک دم میں بہارِ شبِ عشرت ہوئی آخر

گل ہو گئیں شمعیں نفسِ بادِ سحر سے

ہے دور میں ساغر کے یہاں جلوۂ خورشید
رندوں کا الگ دائرہ ہے دورِ قمر سے
جانے کا تری بزم سے رستہ نہیں ملتا
یہ بھی نہ رہا یاد کہ آئے تھے کدھر سے
عالم میں سخن فہم کسی کو نہیں پاتا
باتیں میں کیا کرتا ہوں دیوار و در سے
انداز نہ اپنا نگہِ مست نے چھوڑا
سو شیشۂ دل چور ہوئے گر کے نظر سے
کچھ وعظ میں شوخی ہے نہ انداز میں گرمی
محروم جو ہے زاہدِ خشک آتشِ تر سے
نکلا ہوں نہ نکلوں گا کبھی کوچے سے تیرے
اوٹھا ہوں نہ اوٹھوں گا کبھی میں ترے در سے
عزلت تری ہم کو بھی پسند آ گئی اے سرو
اب ہم نے بھی دامن کو لپیٹا ہے کمر سے
پھر ساغرِ جم ہو تو نظر بھر کے نہ دیکھیں
لبریز کیا جام کو جب خونِ جگر سے
اے نظم اوٹھا زانوئے غم سے نہ ترا سر

نکلا سحر خورشید گریبان سحر سے

۲۲۳ ۲۶

چھائی ہے محبت جو دھواں دھار کسی کی
صورت نظر آتی نہیں جز یار کسی کی

عبرت مجھے ہوتی ہے پلٹنے پہ صدا کے
اک بات اُٹھاتا نہیں کہسار کسی کی

یوں مر کہ نہ یاروں کو ہو بھاری ترا مردہ
یوں جی کہ طبیعت پہ نہ ہو بار کسی کی

اچھی بھی گذر جاتی ہے انساں کی بری بھی
رہ جائیگی آسان نہ دشوار کسی کی

پانسے کی طرح کروٹیں لیتا ہے ستارہ
ہے جیت کسی کی نہ سدا ہار کسی کی

کہتا ہے قلم سجدوں میں جبتک کٹے عمر
کیونکر ہو زباں واقفِ اسرار کسی کی

مارے ہوئے ہیں عشق کے نرگس ہو کہ گل ہو
زخمی یہ کسی کا ہے وہ بیمار کسی کی

اوس ترک کا کھینچیں گے گریباں تہِ محفل
ہاتھ آج کسی کا چلے تلوار کسی کی

سبزہ پہ بکھر جاتا ہے جب سبحہ شبنم
پڑھتا ہے وہ تسبیح لگاتار کسی کی

مرقد ہی پہ بس جاکے تھمے گا فرس عمر
کب ان کو ملے گا یہ رہوار کسی کی

بوسے ترے پیکان کے لیتا ہے کوئی زخم
پہنچی ہے منی تالب سوفار کسی کی

تڑپا گیا دل کو مرے بجلی کا تڑپنا
دکھلا گئی جھلکی مجھے ہر بار کسی کی

گرچی ہوئی دیوار ہے زنداں کی ہماری
زنجیر میں دیکھی ہے یہ جھنکار کسی کی

مرقد وہ جگہ ہے کہ اوتر جاتا ہے سر سے
تاج اس میں کسی کا ہو کہ دستار کسی کی

بسمل ہوا جاتا ہوں تڑپتا نہیں لیکن
تڑپوں گا جو خالی گئی تلوار کسی کی

واعظ ہو کہ ناصح ہو یہ ہے فصلِ بہاری
ہم رند اوٹھائیں گے نہ زنہار کسی کی

کچھ پاس ہے تم کو نہ فلک کو نہ اجل کو
آنکھوں میں مروت نہیں اے یار کسی کی

دل سے وہ باتیں میں کیا کرتا ہوں پہروں
کیا دل میں اتر جاتی ہے گفتار کسی کی

کاٹوں میں گلا ورنہ گردن پہ چلے تیغ
تقدیر سے چلتی نہیں زنہار کسی کی

پامال کرے شوق سے مجھ کو سرِ محشر
سیکھی ہے قیامت نے جو رفتار کسی کی

وہ رشکِ مسیحا نہیں آتا تو چلے ہم
دیکھے گا نہ اب راہ یہ بیمار کسی کی

چھپ چھپ کے بھی دیکھوں تو جھپ جاتی ہیں نظریں
اتنی بھی نہ ہو طاقتِ دیدار کسی کی

تم غیر سے ملنے کو کرتی تو ہو لیکن
بھولے سے قسم کھائی ہے سو بار کسی کی

کیا ضبطِ محبت نے گلا گھونٹ کے مارا
فریاد بھی جیسے کہ گنہگار کسی کی

میں پاؤں پہ گرتا ہوں اٹھ اے فتنۂ محشر
ملتی ہے تری چال سے رفتار کسی کی

رعشہ سا نظر آتا ہے شاخِ گلِ تر میں
لڑنے پہ کلائی جو ہے تیار کسی کی

۲۲۴ —— ولہ —— ۴

کیا عاشقِ ناشاد کو وہ شاد کریں گے
آئیگا اگر رحم تو بیداد کریں گے

یہ تیرا ستانا بھی بہت یاد کریں گے
ماتم ترا برسوں دلِ ناشاد کریں گے

جب وہ کوئی طرزِ ستم ایجاد کریں گے
یاد آؤنگا میں تجھکو بہت یاد کریں گے

رہ جائیگی بات اور نکل جائیگا پیامبر
اے پیرِ مغاں ہم تجھے کیا یاد کریں گے

۲۲۵ —— مفعول مفاعیلن دوبار —— ۱۸

یہ ذوقِ تماشا کا حاصل نظر آتا ہے
اندھیرا اب آنکھوں سے تو دل [illegible] آتا ہے

تو آپ ہی اپنے میں شامل نظر آتا ہے
اور آپ کو پایا تو مشکل نظر آتا ہے

عالم میں گراں مایہ بس دل نظر آتا ہے
[illegible] کا حاصل نظر آتا ہے

جلدی ہے پہونچنے کی مجھکو درِ جاناں تک
اک ایک قدم اب تو منزل نظر آتا ہے

گرداب سے رہ ہر کشتی کو بچا کر چل
گرداب کے نکلنے میں ساحل نظر [illegible]

اے ذوق نوا مجھی پھیری ہے [illegible]
[illegible] آئینہ [illegible] دل نظر آتا ہے

بس ایک ہی پرتو کا سارا یہ کرشمہ ہے
آئینہ خانہ بھی محفل نظر آتا ہے

دے آئینۂ دل کو پرواز کدورت سے
آئینہ تو [illegible] بھی باطل نظر آتا ہے

کشتی ہو جو طوفانی اوس وقت خدا اسکو
منجدھار سے کر ساحل نظر آتا ہے

بیدار رہ و خدا سے ڈر لو زرا اسکو تم اے گلچیں
مجھ کو تو وہ اک غنچہ اک دل نظر آتا ہے

بس نام ہی نام اب تو سنتے ہیں محبت کا
اس شے کا بھی کوئی [illegible] نظر آتا ہے

گنجینۂ معنی ہی ضائع نہ کر اس دل کو
سب اس میں ہی عالم کا [illegible]

حسن اور محبت کا لازم ہے تہاں رہنا
[illegible] جان نہاں ہے کب دل نظر آتا ہے

گر دیر و حرم آمودہ یا رنگ پردہ ہے
[illegible] محمل نظر آتا ہے

یارب یہ سودا ہے کس کے دلِ پرخوں کا
ہر برگِ گلِ لالہ میں جو دل نظر آتا ہے

کشتی کو لگا دے پار اے بادِ مراد آکر
آغوش کو پھیلائے ساحل نظر آتا ہے

خائن ہو وہی انساں ہے ظالم و جاہل بھی
جو بار امانت کا حامل نظر آتا ہے

یارانِ سخن گو سب اہلِ نظر ہیں اہلِ دل
اس بزم میں تو لیکن بیدل نظر آتا ہے

۲۲۶ —— فعلاتن مفاعلن فعلات —— ۱۹

ہوں جو مہمان رات بھر کے لئے
حشر برپا کریں سحر کے لئے

سوزِ دل کیا بجھے کہ آپ آئے
آگ لینے کو لمحہ بھر کے لئے

جتنے عشوے تھے چشمِ ساقی میں
اوٹھنے ساغر حباب کر کے لئے

تیری زینت گہر سے کیا ہو گی
آبرو ہو گئی گہر کے لئے

پہلے جو دامن و گریباں تھا
اب ہے رومال چشمِ تر کے لئے

پہلے ہاتھوں سے تھامتا تھا جگر
ہاتھ ملتا ہوں اب جگر کے لئے

دمِ رفتار حشر نے اوٹھ کر
قدم اوس شوخ فتنہ گر کے لئے

کیوں لگائی ہے ڈاب کافی تھا
ایک چھلا تری کمر کے لئے

نزع میں سب نے ہر طرف دیکھا
آپ آئے نہ لمحہ بھر کے لئے

تم تو سمجھے تھے زیست ہی کو عذاب
لاکھ ہیں آفتیں بشر کے لئے

قصرِ شب کے کنگروں پہ نالوں نے
ٹھوکریں کھائی ہیں اثر کے لئے

نذر لائے جو بزم میں ساقی
رہتے دینا نظر گذر کے لئے

سر کو رکھے ہوں خاکِ در پہ تری
کہ یہ ٹھنڈا ہے دردِ سر کے لئے

کیا تغافل ہو گیا اگر دیکھا
دل تڑپتا تھا اک نظر کے لئے

نگہ التفات جس کی ہو — اوس کا بندہ ہوں عمر بھر کے لیے

موت کا ڈر تو کچھ نہیں لیکن — زاد رہ چاہیئے سفر کے لیے

بے سر و پا جو ہو کرے کیا فکر — پاؤں کے واسطے کہ سر کے لیے

کبھی کھلنا کلی کو ہو نہ نصیب — بند مٹھی رہے جو زر کے لیے

ہجر کی رات ہے یہ رات اے نظم
منتیں مانئے سحر کے لیے

۲۲۷ ——— ولہ ——— ۱۵

راز افشا کہیں نہ ہو جائے — فتنہ برپا کہیں نہ ہو جائے

حب دنیا کہیں نہ ہو جائے — دیکھ سودا کہیں نہ ہو جائے

کون واعظ کے منہ لگے جا کر — مفت جھگڑا کہیں نہ ہو جائے

خون دل آتے آتے اسکو نہیں — تھوڑا تھوڑا کہیں نہ ہو جائے

دیکھ لے آنکھ بھر کے دنیا کو — یہ تماشا کہیں نہ ہو جائے

خواب مرقد میں بھی یہ دھڑکا ہے — حشر برپا کہیں نہ ہو جائے

ضبط نالے نہ کر دل بیمار — درد پیدا کہیں نہ ہو جائے

بڑھتے بڑھتے یہ کاکل شب رنگ — شب یلدا کہیں نہ ہو جائے

ناز کو ہے خیال پردہ دری — کوئی رسوا کہیں نہ ہو جائے

نہ لب بام مجھ کو بلواؤ — لب دریا کہیں نہ ہو جائے

پھر نہ چہرے پہ چھوڑیئے زلفیں ‏ ‏ پھر اندھیرا کہیں نہ ہو جائے
شام ہی سے سحر کا ذکر نہ کر ‏ ‏ دل کو دھڑکا کہیں نہ ہو جائے
دل پر سوز پر نہ رکھو ہاتھ ‏ ‏ ید بیضا کہیں نہ ہو جائے
صاف ہے چاندنی نہ اٹھو نقاب ‏ ‏ چاند دھبا کہیں نہ ہو جائے

اتنا دعوئ نیاز کا اے نظم
ناز بیجا کہیں نہ ہو جائے

۲۲۸ ولہ ۱۳

طرز دکھلا دے اوس کی قامت کے ‏ ‏ پاؤں پڑتا ہوں ہیں قیامت کے
دن نہ گنئے اگر مصیبت کے ‏ ‏ ہم تھے مہمان چند ساعت کے
میرا ساغر رہا نہیں خالی ‏ ‏ صدقہ ہو جاؤں اس کی رحمت کے
دل لگا کر کوئی سنے تو کہوں ‏ ‏ جو فسانے ہیں دل کی حسرت کے
وقت پر تم نے لی خبر ورنہ ‏ ‏ مر گئے ہوتے ہم تو مدت کے
گر نہیں ہے ریا تو رندوں میں ‏ ‏ ہیں یہ آثار اہل جنت کے
مشت خاک اور ہما ہی اپنی ‏ ‏ کارخانے ہیں تیری قدرت کے
اے صبا تذکرہ وطن کا نہ کر ‏ ‏ رہنے والوں سے دشت غربت کے
فاتحہ پڑھ کے لی جو ٹھنڈی سانس ‏ ‏ جھلملائے چراغ تربت کے
کھل گیا رازِ دل نہ مدفن پر ‏ ‏ پھول نکلے جگر کی رنگت کے

اگر گوش گل تک رسا ہو گئی
تو شبنم ور بے بہا ہو گئی

مری امید باب صبا ہو گئی
ابھی آئی تھی پھر ہوا ہو گئی

تھی فرصت عمر یا شمع تھی
ذرا جھلملائی فنا ہو گئی

جو حکم مبرم کہا اس نے کٹ
عیاں فصل بسمل ما سوا ہو گئی

سیاہوں سے رندوں کے ظلمت جو تھی
سمٹ کر وہ کالی گھٹا ہو گئی

گرد قافلہ تک پہونچنے میں گرد
بہت دور بانگ درا ہو گئی

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں
غضب ہے جو غفلت ذرا ہو گئی

ہے آپس میں اب تو فساد و نفاق
محبت وہ اگلی ہی کیا ہو گئی

گری تھی ابھی برق مسلک نگاہ
وہ تھی گر کے تیغ قضا ہو گئی

نظر کا نظر سے لڑانا تھا
لڑائی کی اس پر بنا ہو گئی

زیادہ تمنا بھی اچھی نہیں
اجل آتے آتے خفا ہو گئی

ہوئی ہاتھ ملتے ہی ملتے ملنا
جوانی تو رنگ حنا ہو گئی

۲۳۱ ــــ فاعیل مفاعلن مفاعیل ــــ ۱۰

بدعت مسنون ہو گئی ہے
امت مطعون ہو گئی ہے

کیا کہنا تری وعدہ کا زاہد
گردوں کا ستون ہو گئی ہے

رہنے دو اجل جو گھات میں ہے
مجھ پر مفتون ہو گئی ہے

حسرت کو غبارِ دل میں ڈھونڈو | زندہ بہ قرون ہو گئی ہے
وحشت کا تھا نام اوّل اوّل | اب تو وہ جنون ہو گئی ہے
واعظ نے بری نظر سے دیکھا | مے شیشے میں خون ہو گئی ہے
عارض کے قریں گلاب کا پھول | ہمرنگ کی دون ہو گئی ہے
مل کر دیو و ملک کی سیرت | طرفہ معجون ہو گئی ہے
بندہ ہوں ترا زبان شیریں | دنیا ممنون ہو گئی ہے

شیدا رشبِ غم ہیں مرگ ناگاہ
شادی کا شگون ہو گئی ہے

۲۲۰ —— تضمین دعائیہ —— ۱۴

فلک مطیع رہے بخت سازگار رہے | اساس دولت و اقبال پائدار رہے
بہ اوج منزلت و جاہ برقرار رہے | ہمیشہ خلق میں عنواں ترا وقار رہے

نبی کا لطف رہے فضل کردگار رہے

فروغ مہر پہ چشمک کرے نگین دکن | چمک سے جس کی قمر و زہرہ ہو جبین دکن
فلک پہ سنبلہ ہو جائے خوشہ چین دکن | عروج پائے ترے دم سے سرزمین دکن

ترے قدم کا سر آسمان غبار رہے

اسی طرح سے رہے اوج موجِ شوکت میں | اسی طرح سے رہے بہرہ دولت میں
یونہی نسیم طرب گل فشاں ہو صحبت میں | خزاں نہ آئے کبھی تیرے باغ عشرت میں

هرچند که گردون همه بر جور و جفا داشت | از فکر بیا سود دل من که عنا داشت
تا عکس تو دافگند بشوخی و روان شد | آئینه او حیرت نقش کف پا داشت
در دست خجالت ستم او و ز دو حسا بود | این روز وندانم ید بیضا ز کجا داشت
خون جیتی و عربدها کردی و شادم | دانم که برین کار ترا ناز و ادا داشت
چون قافله همه خرد و هوش روان شد | رنگینه پرید از رخ من بانگ درا داشت
فریاد ازین عاقبت طالب دنیا | میرفت بسوی عدم و رو بقفا داشت
آن طائر نادان که بقید قفس آمد | بے چاره نداندست که در پیش چه ها داشت
دل دوخت به ناوک کشش مژه جادو | دنباله او ره ز کجا تا به کجا داشت
در دولت این خسرو عادل عجب اینست | دیدم صف مژگان که دو صد فتنه بپا داشت
بستیم و این مطلع برجسته بجو انداز م | تجیش شه ذیشان که لقب ظل خدا داشت

۲۱۴ —— (مطلع) —— ۱۱

صد لطف بهر عاجز و مسکین شه ما داشت | شه دست کرم داد و دست دعا داشت
هنگام تکلم لب لعلش گهر افشاند | هر گوهر غلطان بگره آب بقا داشت
صد نکته فزود است بدیوان ستایش | صد عقده کشود است بفکری که رسا داشت
آوازه شنیدیم و دو دیدیم ببوسیش | سنگ ره او منزلت کوه صفا داشت
تا رایت اقبال تو بر اوج ظفر تافت | افشاند براهش پر و بالی که هما داشت
تا عدل شهی مژده امنے بجهان داد | تا کشته گردون که سر جور و جفا داشت

از نکہتِ تعش ملکِ دکن تازہ جواں شد
شمشیر و کمر داد بہ پیرے کہ عصا داشت

تا معدلتش دستِ ضعیفاں بہ گرفتہ
دیدیم پرِ کاہ کشش کاہربا داشت

تا از نفحتِ بادِ بہاری بوزیدست
گلزارِ دکن از سرِ نو نشو و نما داشت

بدخواہ تو گشت است چناں عاجز و رسوا
دیدند کہ او پایہ بگل و سر بہ ہوا داشت

صد بار دم از ناز و تفاخر بزند نظم
بالے بہ صفِ حاشیہ بوسانِ تو جا داشت

(نظام گزٹ سے منقول ہوا)

۲۴۵ ۷

اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اپنے پروردگار کی نعمت کا ذکر کرو

اعلیٰ حضرت ظل اللہ کا وجود ذی جود ایسی نعمت ہے جس کی تاریخ اوراق روزگار و صفحات قلوب پر ابدآلاباد تک نقش رہے گی جن کی نعمتوں کی برکتوں کا شمار و احصاء زبان و قلم کے حیطۂ امکان سے باہر ہے یہ ترانہ سالگرہ باتمثال امر باری زبان قلم پر جاری ہوا۔

آٹھ معین قافیوں میں سات شعر کی قید تھی

(حیدر یار جنگ سید علی حیدر نظم طباطبائی)

جوشِ گل جوشِ طرب جوشِ بہار است اینجا
گل فشاں نغمہ زمنقارِ ہزار است اینجا

از چراغاں شدہ ہر کوچہ و برزن پر نور
کہکشاں جادۂ ہر راہ گزار است اینجا
شعلہ و رشتۂ شمع است بہم پیوستہ
تاج زرّیں ز طرب بر سر خار است اینجا
من کہ در ظلِ خدا نور خدا می بینم
چشم برہم زنم جلوۂ یار است اینجا
شام یک مژدۂ امن است و سحر مژدۂ عیش
ہر دو یک اند مگو لیل و نہار است اینجا
شب این جشن و فلک عقد ثریا در دست
یعنی این سلکِ گہر بہر نثار است اینجا
نغمۂ نظم کجا بار درین بزم نجبا
سجعے خوش ز امیران کبار است اینجا

٢٣٦ — ملمع — ٢٢

وارفتۂ حرفِ حق ہیں اہلِ توفیق | مشغول بھی جو ہو تو جانتے ہیں مصری
یہ موعظۂ پیرِ طریقت سمجھو | طبتم اخذتم علیہا اصری

رباعی

سالک کو فروتنی سے کب چارہ ہے | سالک وہ نہیں جو محوِ نظارہ ہے

دیکھو آنکھیں جو دونوں نیچی کر لیں | پہلے جو ستارہ تھا وہ سیارہ ہے

رباعی

آئینہ سے نیک نام اسکندر ہے | آئینہ جڑا ہوا انگوٹھی پر ہے
نام اس کا اسی نگینہ پر ہے کندہ | شاہی کا نگیں ہو نہ اب انگشتر ہے

رباعی

جو ظلم کئے تھے وہ ذرا سہہ تو سہی | انصاف خدا کے ہاتھ سے لے داد تو سہی
مظلوم بھی ہو اور یہ محشر بھی ہے | ظالم نطقاً و سیفاً اب کہہ تو سہی

رباعی

جو معنی برجستہ ہیں سب بندھتے ہیں | جب بندھتے ہیں مضمون عجب بندھتے ہیں
ہیں قلم سخن اس سے ہوں شیریں یہ کلام | کھلتی ہے اگر زبان تو لب بندھتے ہیں

رباعی

دل کی حرکت کو اضطراری سمجھو | یہ طائر جاں کی بیقراری سمجھو
ہے عمر فقط چند نفس کی میعاد | جینے کو فقط نفس شماری سمجھو

رباعی

دنیا اک ہولناک ویرانہ ہے | اور طول امل فسوں و افسانہ ہے
لالچ سے حذر چاہیئے عقبیٰ ہو گر یہ | وہ خوک ہے اور یہ سگ دیوانہ ہے

رباعی

رباعی

افلاس میں اسلاف کی عزت تو ہے | زر پے گرگلوں میں نکہت تو ہے
ہر حال میں اخلاق کریمانہ رکھ | دولت تو نہیں رہی شرافت تو ہے

رباعی

دعویٰ ہم کو یہ ہے کہ لائق ہم ہیں | بے علم و کمال سب پہ فائق ہم ہیں
کہتی ہے مگر ہماری تن آسانی | خود اپنے لئے مانع و عائق ہم ہیں

رباعی

سودا ہے ہزار طرح کا سر ہے ایک | خطرے لاکھوں ہیں اور خاطر ہے ایک
حرص۔ آز حسد عجب غضب جہل ہوس | سا تا رو ہزن ہے اور مسافر ہے ایک

رباعی

ظاہر میں تو خاطر پدارتیں ہیں | دل میں بیٹھا ہے چور اور گھاتیں ہیں
باقی نہیں ہم میں اتفاق کلمہ | جتنے منہ ہیں بس اتنی ہی باتیں ہیں

رباعی

کچھ دخل کوئی فہم کو دیتا ہی نہیں | اب تک نافہمیوں سے چیتا ہی نہیں
ہر بات ہی تیری بہری دیکھا دیکھی | اب عقل سے کوئی کام لیتا ہی نہیں

رباعی

غافل ہیں ہمیں فکر پس و پیش نہیں | یعنی کہ مقدر ہیں کم و بیش نہیں

سو مرتبہ حادثوں نے کھولی ہے آنکھ | اب بھی نظر عاقبت اندیش نہیں

رباعی

ایسا بھی کہیں حد سے گذر جاتے ہیں | جو دل میں آگئی وہ کر جاتے ہیں
اچھے نہیں اطوار ہمارے اے نظم | لوگ ایسے ہی جوان مر جاتے ہیں

رباعی

دریا میں ہوں اور اہل نظر پیاسا ہوں | پہلے سے بھی اب تو بیشتر پیاسا ہوں
سچ کہتے ہیں آبِ شور ہے یہ دنیا | میں ڈوب کے مر گیا مگر پیاسا ہوں

رباعی

ہر عضو بدن نزع میں گھل جائے گا | یہ جسم کہیں خاک میں مل جائے گا
تا زیست تو کی ہے پردہ داری تم نے | مرقد میں مگر خضاب کھل جائے گا

رباعی

میں تا لبِ گور عمر بھر میں آیا | دم میرا لبوں پہ اس سفر میں آیا
اس طرح سے پیری نے مروڑا مجھ کو | جو زلف میں خم تھا وہ کمر میں آیا

رباعی

جس کو نہ غم مآل اصلا ہوگا | پھر خاک اُسے اندیشۂ فردا ہوگا
کیفیت حال میں ہر اک شخص ہے مست | یہ فکر نہیں کسی کو اب کیا ہوگا

رباعی

گو اب نہیں مال و جاہ و دولت باقی — باقی ہے خدا اور اس کی رحمت باقی
سو مرتبہ ہو جائے زوالِ نعمت — سب کچھ باقی ہے گر ہے ہمت باقی

رباعی

کیوں سو رہے جا کے گور کی منزلیں — خالی تھی جگہ ان کے لئے تو دلیں
کچھ شعر لکھے تھے وہ سنانے اے نظم — افسوس کہ میکش نہیں اس محفل میں

تاریخیں

تہنیت عقد ثانی اعلیحضرت خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

ہے آج جشن کہ سرکار عقد میں لائے — عروس آئینہ رخسار و ماہ سیما کو
زہے شکوہ سلیماں کو مل گئی بلقیس — زہے فروغ کہ یوسف [illegible] زلیخا کو
تو جا کے بزم میں اے نظم عقد کی تاریخ — یہ عرض کر کہ مبارک حضور والا کو
(۱۳۲۱ھ)

تاریخ تعمیر کتب خانہ آصفیہ

بنا نمود کتب خانہ آصف ہفتم — رساند ذروۂ اعلیٰ بہ اوج مرتبتش
نوشت نظم دعا گو چو دید بنیادش — کہ ہٰذہ الکتب القیمہ است تاریخش
(۱۳۲۹ھ)

تاریخ ترجمۂ وکار آف ویکفیلڈ

ترجمہ اردو میں انگریزی فسانہ کا ہوا — واقعی باتیں لباسِ استاں پہنے ہوئے

ایک مصرع میں ہوئی تقریظ بھی تاریخ بھی	ہے فرنگن زیور ہندوستان پہنے ہوئے (۱۳۰۲ھ)

تاریخ طبع دیوان میر ذاکر حسین یاس مرحوم

ہر شعر سے حسن خوش بیانی نکلے	ہر لفظ سے لطف نکتہ دانی نکلے
اے نظم چھپے نہیں یہ اشعار تمام	پتھر سے چشمۂ معانی نکلے (۱۳۰۶ھ)

تاریخ ولادت نواب شہنواز جنگ بہادر

کیا ستارہ سا پسر حق نے دیا	حسن میں ہے غیرت ناہیدیہ
دایہ سے حیرت میں ہاتف نے کہا	آگیا ہے گود میں خورشید یہ (۱۳۱۲ھ)

تاریخ مثنوی ضیائے دکن

جناب مولوی باقر حسن نے	لکھے کیا پر ضیا و روشن اشعار
مضامین انکے سب ہیں دُرِ غلطاں	قلم کا ہے سواد ابر گہر بار
یہ شیرازہ ہے یا موتی گندھے ہیں	خجل ہے عقد مروارید کا تار
ہوا ہے نظم یہ مصرع تاریخ	یہ سب اشعار ہیں لولوی شہوار (۱۳۰۸ھ)

تاریخ دیوان حبیب کنتوری مرحوم

چھپ گیا کیا خوب دیوان حبیب	سب سخنور محو نظارہ ہوئے
نظم میں نے طبع کے گن کر سنین	کہہ دیا تیرہ سے اٹھارہ ہوئے (۱۳۱۸ھ)

تاریخ دیوان نواب نوصاحب رفعت مرحوم

فکر رفعت کی بلند اور طبیعت رنگین	کہنا اس طرح ہے تابوں میں جسے کہتے ہیں

اونکے دیوان کی تاریخ یہ لکھی میں نے | سحر ایسا ہو اس اردو میں جسے کہتے ہیں

(۱۳۲۲)

مجھے ہمیشہ سے تاریخ کہنے سے انکار ہے تاریخ فن شعر میں داخل نہیں ہے مگر مجبور ہو کر کہہ بھی لیتا ہوں نواب عزیز یار جنگ بہادر مرزا داغ مرحوم کے ایک خوش فکر شاگرد ہیں میرے پاس آئے اور اپنے دیوان کی تاریخ کہنے کے لیے مجبور کیا میں نے یہ مصرع کہا:-

"داغ کا انداز اس دیوان میں ہے"

(۱۳۲۹)

تاریخ وفات نواب معتمد الدولہ بہادر مرحوم

بسکہ ہے آبستن[1] موت و حیات | حیف یہ عبرت کدۂ ایرمان[2]

جو کوئی اس دار فنا سے گیا | پھر کے نہ آیا وہ کبھی پھر یہاں

اوٹھ گیا اس بزم کی حیف ایک میہ | باذل و ذی رتبہ و والامکاں

رہ گیا نیکی کا زمانہ میں ذکر | مٹ گیا ایثار و کرم کا نشاں

غم سے برا حال ہے احباب کا | درد و الم دل میں ہے لب پر فغاں

نام بھی مرحوم کا تاریخ بھی | ہیں اسی اک بیت سے دونوں عیاں

معتمد الدولہ بہادر نے ہائے

کوچ کیا سوئے نعیم جناں

(۱۳۲۸)

---

[1] آبستن بمعنی حاملہ [2] ایرمان بمعنی عاریت ۱۲

تاریخ وفات علی فرزند سید محمد تقی صاحب

ماں باپ کی آنکھوں میں تھی تیرہ و تاریک
ذی الحجہ کی ستر ھویں رحلت سے علی کی
افسوس کہ بس اک سال اور آٹھ مہینے
کیا گھر میں اُجالا تھا طلعت سے علی کی
اس واقعہ کی اے نظمؔ فصلی ہے یہ تاریخ
اندھیرے دنیا میں فرقت سے علی کی

(۱۱۰۱ — ۱۴۴۰)

تاریخ وفات استاذ علامہ جناب قائمۃ الدین رحمہ اللہ تعالیٰ

مَاتَ الفَقیہُ الالمعُی المقتدیٰ
وقد استباح الکنز مِنْ عُلیا التقیٰ
مذلم یزل للذین قائمۃ و رکن
للھدایۃ والزمان بہ اقتدیٰ
فنجوم اوجات الشریعۃ قد ھوت
وَسِراجُ انوارِ الھدایۃ قد خبیٰ
ارّختُ عام الارتحالِ بمصرع
لتزلزلت واللہ ارکان الھدیٰ
(۱۲۹۸ھ)

تاریخ وفات سید بلگرامی مرحوم

ہوش نے رامپور سے لکھا | کہ ہے رنج و غم و الم کا ہجوم
ان کے والد نے انتقال کیا | اور تاریخ میں کروں مرقوم
پڑھ کے خط میں نے کہہ دیا دو بار | سید بلگرامی مرحوم

سہرا بتقریب شادی آغا سید حسن اطال اللہ عمرہ

سر پہ نوشہ کے جو ہے رو عارض کا سہرا | عکس ہے لب کے بنا لعل یمن کا سہرا
سر پہ آنچل جو پڑا ہو گیا دونا جلوہ | کہ ہے سہرا یہ دوپٹے کی کرن کا سہرا
اور شہوار چمکتے ہیں ستاروں کی طرح | موتیوں کا ہے کہ پروین و پرن کا سہرا
چشمکیں کرتا ہے جھرمٹ یہ ستاروں کا کبھی | اور کبھی رنگ اڑاتا ہے چمن کا سہرا
پشت پہ جیسے سورۂ اخلاص کی جا سو بالوں | اک تجلی ہے رخ جلوہ فگن کا سہرا
کیا چمک طرۂ دستار پہ نوشہ کے ہے | جب سے سہرا کا لگا رنگ ہے دلہن کا سہرا
یہ تجلی کسی نوشہ میں نہ دیکھی ہوگی | سر پہ خورشید کے جب ہے کرن کا سہرا
آئینہ سج میں دیکھا کیا یہ راز و نیاز | اور دیکھا نوشاہ کے طرہ میں دلہن کا سہرا
گل عارض کی صباحت کا مسلسل ہے جو گل | یہ غزل ہے گل نسرین و سمن کا سہرا
یار ور تو نے کیا نخل تمنا یارب | تو نے دکھلا دیا اس رشک چمن کا سہرا
جوہری نے بھی اسطرح پروئے موتی | جس طرح نظم نے لکھا ہے حسن کا سہرا

عبارتِ خاتمہ

یہ سب غزلیں مشاعروں کی ہیں یا گلدستوں کی طرحوں میں
یا بعض بعض احباب کی فرمائشی زمینوں میں ہیں میں خود سے کبھی غزل
نہیں کہتا۔ ردیفیں پوری نہیں ہیں اور الف بے کا پورا کرنا میں ہمیشہ
سے فضول سمجھتا ہوں غزل میں مقطع کا ہونا نہ ہونا میرے نزدیک
یکساں ہے دیوان برسوں سے مرتب ہو چکا تھا مگر چھپنے کا وقت
اب آیا میں نے پھر سرے سے آخر تک ایک نظر ان غزلوں پر
ڈالی اور اکثر مقاموں میں تغیر و تبدیل بھی کی ہے۔ میری اردو
بھی فارسی سے کم نہیں ہے میں نے فارسی کی طرحوں میں جو غزلیں
کہی تھیں وہ بھی اس مجموعہ میں شامل کر دیں ان غزلوں میں جا بجا معشوقانہ
اداؤں کی تصویریں کھنچی ہوئی ہیں۔

خدا ظاہر پرست و ریا منش لوگوں کی نظر بد سے اس نگارستان کو
محفوظ رکھے!

مقصورات فی الخیام کانہن اللؤلؤ المکنون

جعلنا هن ابکاراً عربا اترابا

ڈیروں میں رہنے والی غزال چشم عورتیں (اعرابیہ بدویہ)

گویا کہ وہ در مکنون ہیں ہم نے ان کو کواری چاہنے والی سہیلیاں بنایا

ہے۔

علی حیدر طباطبائی

کتبہٗ محمد عبد الستار کاتب مکتبہ ابراہیمیہ

چند علمی کتابیں

مقدماتِ عبدالحق مولوی عبدالحق صاحب بی اے (علیگ) پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ و معتمد انجمن ترقی
اردو (اورنگ آباد) کو مقدمہ نویسی و دیباچہ نگاری میں جو شہرت حاصل ہے وہ کسی تعریف کی محتاج
نہیں۔ یہ مولانا کے کل مقدمات کا ایک بیش بہا گراں قدر اور نایاب مجموعہ ہے جس میں مذہب فلسفہ تاریخ
یا تذکرہ زبان و ادب مختلف موضوعات پر وہ عالمانہ اور بسیط مقدمے ہیں جو اردو زبان
کی بہت سی متعدد و بلند پایہ کتابوں کے ساتھ ہیں اور جو بجائے خود بھی اپنے موضوع پر فاضلانہ مقالے
ہیں۔ قیمت حصہ اول (ے) حصہ دوم (عاں)

مثنویاتِ میر

مرتبہ مولوی سید محمد ایم اے۔ یہ اردو شاعری کے سرتاج میر تقی میر کی جملہ مثنویات کا مجموعہ
ہے جو متعدد قلمی نسخوں کے باہمی مقابلے اور بڑی تحقیق و تلاش کے بعد ترتیب دیا گیا ہے۔
مثنویاں اپنی اعلیٰ شعریت کی وجہ سے اردو ادب میں شاہکار ہیں۔ مثنویات میر جامعہ عثمانیہ
کے لیے امتحان ایم اے اور دوسری جامعات کے اعلیٰ اردو نصاب میں شریک ہیں۔ لائق مرتب
نے بڑی صحت کے ساتھ مثنویاں ترتیب دینے کے علاوہ ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ بھی لکھا ہے
اور میر صاحب کی سوانح حیات ان کے کارناموں اور مثنویات پر بلند پایہ تعمیری تنقید
کی گئی ہے۔

مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

صفحہ	سطر	لفظ
۱۴	۱۷	اس قدر لی چٹکیاں
۱۵	۱	ہوئی الجھن بڑا
۱۷	۷	شُعاع
۲۲	۴	وحوت
۲۸	۲	کب اُس
"	۷	(۱۷) ولہ
۳۳	۱۲	نہس یک
۳۴	۳	ہوا
۳۵	۷	اٹھی
۳۹	۱	x
"	۹	مجھ کو
"	۱۲	جو یارانہ
"	۱۵	دست چرہا
۴۱	۷	میں
۴۳	۱۲	نازہے
۴۵	۷	آنسوں
"	۹	ڈھلنا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷۹	۳	عشقش بیامد ہم	عشقش بیا سایم
"	۸	ہم ست	ہم است
۸۲	۴	له	کہ
"	۱۱	میست	نیست
"	۱۶	حکاتے	حکایتے
۸۴	۵	بال و پری	بال پری
"	۱۴	غرض	عرض
۸۵	۴	۱۹	۱۱
۸۶	۱	کیطرح زمین	کیطرح ولہ زمین
۸۷	۲	دوریاش	دورباش
"	۱۱	سوال	سوال
۸۸	۳	مشک و بو	مشک بو
۸۹	۵	کشتی	کشتی
"	"	صد	پسر
۹۰	۹	دست و یا	دست و پا
"	۱۳	مائم	مائیم
"	"	ما گہر	ما بہ گہر

۹۱	۱۵	نفس	نفس امارہ
۹۳	۵	تھی	تھے
"	"	حلاحل	جلاجل
۹۶	۷	نغزش	لغزش
"	۶	تعزر	تعزیر
"	"	حسینونکے	حسینوں کے
۹۹	۹	پہرُا	پہرا
۹۹	۱۱	ڈھلجانے	ڈھل جانے
۱۰۰	۵	ہیں	میں
۱۰۰	۶	افسانہ پہ پھر	افسانہ پر
۱۰۰	۱۵	یا نہیں	یا نہیں
۱۰۲	۱۱	پروانہ	پروانوں
۱۰۴	۲	کہ سی	کہ اسے
"	۶	آگے	آکے
۱۰۵	۱۴	پھر سر	تیر پہ
۱۰۶	۱۳	آوازہ	آواز
"	۴	ارسی	آرسی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۰۷	۹	صعیر سے	صعیر شے
۱۱۶	۱	کہیں	کھلیں
〃	۶	گرناب	گرداب
۱۱۷	۱	جبں پشمر	دیں سپ پشہ
〃	۱۷	گرہاں لیطرف	گریباں کیطرف
۱۹	۶	اودھر	اُودھر
〃	۱۶	چاہ و پیار	چاہ پیار
۱۲۰	۱	ررزخ	برزخ
〃	〃	لگا	رنگا
	۴	پڑھ گئے	پڑ گئے
〃	۱۷	رفتی	رُفتی
۱۲۱	۱۰	تشنہ لبیلا	تشنہ لبیا
〃	۱۴	بکشم	بکشتم
۱۲۳	۹	چاہ وپیار	چاہ پیار
۱۳۱	۶	وسانپ	دو سانپ
〃	〃	تھائی	کھاتے
〃	۱۷	باندھے ہو	باندھے رہو

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۴۵	۱۱	تحقق	تحقیق
"	۱۲	نشتزہ	نشتر یہ
"	۱۶	کعبہ و نمبر	کعبہ منبر
۱۴۷	۶	سکوسن	سکون
۱۴۸	۲	وہی حصلاسی کمڑی کی نہیں	وہی چھلاسی کمڑی کہ نہیں
"	۱۵	سنسنان	سنسان
۱۴۹	۳	نگہ مار	نگہ یار
"	۱۶	فریادو	فریاد
۱۵۰	۳	ماقی	باقی
۱۵۱	۱۷	آرادانہ	آزادانہ
۱۵۲	۱	منت ہستی کو کیا	منت ہستی کیا
"	۶	کہ یہ	کہ یہ
"	۱۵	تو یہ	تو یہ
"	۱۶	ادا ہوے	ادا ہوئے
"	۱۷	متجب	تعجب
"	"	تھر	پتھر
۱۵۴	۷	وہ ہر سو	کہ ہر سو

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۵۵	۱۵	ہی ہی	ہی بہی
۱۵۶	۱۷	عبرت سے	ذرہ عبرت سے
۱۵۷	۱	چیڑہتے	چڑہتے
۱۶۱	۲	دروگوہر	زروگوہر
"	۶	ہونکہ	ہوں کہ
"	۸	ٹہرائے	ٹھہرائے
۱۶۳	۵	درویش وعی	درویش وغنی
۱۶۴	۵	ھربدہ	عربدہ
۱۶۵	۸	زہوگہ	ہوگہر
۱۶۶	۴	مضر	مضر نہیں
۱۶۸	۱	ہلال برق	ہلال و برق
"	۱۱	ریک	ریگ
۱۷۲	۳	نبرش	بہ برش
"	۱۵	میرے	میں ہے
۱۷۶	۱۵	بیھی	یہی
۱۷۸	۱۶	خیربھی ہے	خبر بھی ہے
۱۷۹	۱۱	دورسے	دروسے

۱۸۱	۱۱	رضع	رضیع
"	۱۴	یتزمانے	میں سانے
۱۸۵	۲	تری	تیرے
۱۸۷	۱	دود آھ .	دود آہ
"	۱۱	توڑتا	توڑنا
۱۸۸	۱۶	وہ	جو
۱۹۱	۶	حبص بیص	حیص بیص
"	۹	ہوئے	ہوائے
۱۹۲	۴	آزادبھی	آزادابھی
۱۹۳	۱۶	کی مسافت	کی بھی مسافت
۱۹۵	۳	سدیروخوزنق	سدیروخورنق
۲۰۰	۸	نگھ	نگہ
۲۰۵	۱۵	تیغ نو	تیغ تو
۲۰۹	۵	دمبالہ دار	دمبالہ دار
"	۱۰	بھی میں نشہ	بھی نشہ
"	۱۱	سلمنا	سامنا
۲۱۳	۱۰	نچلے	بچاکے

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۱۴	۴	فراوانی	سلیمانی
۲۱۷	۱۶	حقّنے	بیٹھنے
۲۱۸	۱۳	خود نمائی ہے کا	خود نمائی کا ہے
″	۱۶	نمائشی	نمائش ہے
۲۲۶	۱	دے کہ	دے کر
۲۲۸	۱	صداالٹی	صدا الٹی
۲۳۰	۹	چیتم بز	چشم تر
۲۳۸	۸	گرہ	گر
۲۳۹	۹	داد	داد لو
۲۴۴	۷	کرٹیں	کروٹیں
″	۸	لذت	قوت
۲۴۵	۱۷	مثل	مثل رقیب
۲۴۷	۷	لدورت	کدورت
۲۴۸	۹	سجے	سجے سجتے
″	۱۳	ثمر	حصر
۲۴۹	۳	کیا	کیسا
″	۸	وہ	جو

۲۴۹	۱۶	ستوں
〃	۱۷	ہمیں
۲۵۱	۳	چاکر
۲۵۶	۱۰	شک
〃	۱۶	شک
۲۵۷	۹	تو
۲۵۹	۱۵	اونگلیاں
۲۶۰	۵	پلٹنی
۲۶۳	۱۰	دیکھی ہے
۲۶۴	۱۳	حسن
۲۶۵	۱۰	دل کو دہر
۲۶۷	۱	جتی
۲۶۸	۴	سانگیتن
۲۷۲	۱۷	سیہ کاری
۲۷۳	۲	سازی
〃	۴	فلاف
〃	۱۰	تراز

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۲۸۹	۱۷	کہا	کیا
"	"	ہنستا ہے پر اوپر سے	ہنستا ہے اوپر سے
۲۹۰	۱۱	منک	مہ تک
۲۹۱	۲	گتر	گر
"	۱۱	اتنا ہو	اتنا تو
۳۰۰	۱۲	شوحی	شوخی
۳۰۵	۱۱	گلہ	گلا
۳۰۷	۸	پرواز	پرداز
"	۱۴	دل بہ یار	دل بیمار
۳۱۳	۵	مشل	محفل
۳۱۷	۱۵	طبتم احذتم علیہا اصری	لبثتم آخذتم علیہم

مطبع انجمن امداد باہمی کلکتہ ایرانیشن پریس